ڈاکٹر گوپی چند نارنگ
اور
مابعد جدیدیت

حیدر قریشی

Dr. Gopi Chand Narang Aur Maa Baad Jadidiat
By: Haider Qureshi

گوپی چند نارنگ

حیدر قریشی

اس کتاب کی اشاعت کا کریڈٹ بھی ڈاکٹر گوپی چند نارنگ صاحب ہی کو دیا جانا چاہیے۔ **عکاس** کے نارنگ نمبر کا کوئی علمی جواب جب بھی آئے گا اس کا خیر مقدم کیا جائے گا۔لیکن اس کے بعد نارنگ صاحب نے سرقوں کا انکشاف کرنے والے دوست عمران شاہد بھنڈر کے مقابلہ میں ارشد خالد مدیر **عکاس** کو اور ان کے مقابلہ میں مجھے زیادہ زد پر رکھ لیا۔ان کے کارندوں نے کسی دلیل کی بجائے گالی اور الزام تراشی کی زبان میں مہم شروع کردی۔کبھی کوئی بے ہودہ الزام لگایا جا رہا ہے،کبھی کوئی حیلہ سازی کی جا رہی ہے۔اس ساری مہم جوئی کے نتیجہ میں مجھے ہر بار مبینہ الزام کے سلسلہ میں نہ صرف اپنی صفائی دینا پڑی بلکہ حقیقت کو اس طور آشکار کرنا پڑا کہ نارنگ صاحب کی ادبی سیاست کا طریقۂ واردات کھل کر سامنے آتا چلا گیا۔یوں اس کتاب میں شامل بنیادی مضامین لکھوانے کا سہرا بھی ڈاکٹر گوپی چند نارنگ صاحب کے سر بندھتا ہے۔میرے مضامین دفاع کا حق استعمال کرتے ہوئے جواب کے طور پر لکھے گئے ہیں۔گویا یہ مجادلہ میں نے نہیں کیا،مجھ پر مسلط کیا گیا۔اور جب یہ مجادلہ مجھ پر مسلط کیا گیا تو میں نے اس معرکے میں ہر بات پوری دلیل،ٹھوس ثبوت،پورے شواہد اور علمی و ادبی سلیقے کے ساتھ کی۔الزامات کے جواب دینے کے ساتھ میں نے ہر بار بحث کو نارنگ صاحب کے سرقوں کے موضوع پر فوکس کیا۔کیونکہ ان کے تمام حامی نارنگ صاحب کے سرقوں کے موضوع سے فرار کے لیے ہی حیلہ جوئیاں کر رہے تھے۔

حیدر قریشی

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ

اور

مابعد جدیدیت

حیدر قریشی

انٹرنیٹ ایڈیشن

ناشر

سرور ادبی اکادمی جرمنی

Dr. Gopi Chand Narang Aur Maa Bad Jadidiat

By: Haider Qureshi

Year of First Edition 2009

Price Rs. 150/=

نام کتاب: ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اور مابعد جدیدیت

مصنف ومولف: حیدر قریشی

سرورق: محمد حسین نقاش

اشاعت: ستمبر ۲۰۰۹ء

مطبع: جاوید بٹ پرنٹنگ پریس۔لاہور

قیمت: ۱۵۰ روپے

انٹرنیٹ ایڈیشن

Sarwar Adabi Akadmi

Haider Qureshi

Rossertstr.6, Okriftel,

65795 Hattersheim, Germany.

E-Mail: **haider_qureshi2000@yahoo.com**

انتساب

یارِ عزیز ارشد خالد

مدیر عکاس انٹرنیشنل اسلام آباد کے نام

جس نے ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نمبر شائع کرنے کا جرات مندانہ اقدام کیا

تمام شہر ہے شائستگی کا جام پیئے

نہ جانے کیا ہو جو دو چار **بے ادب** بھی نہ ہوں

(احمد فراز)

اظہارِ تشکر

میں شکر گزار ہوں

ادارہ روز نامہ **ہمارا مقصد** دہلی کا

جس نے اس علمی بحث میں میرے جوابی مضامین کو شائع کرنے میں میرا اتنی تیز رفتاری سے ساتھ دیا کہ غیر علمی سطح کے مخالفین لا جواب اور پریشان ہو کر رہ گئے۔

میں شکر گزار ہوں

ادارہ روز نامہ **ہندوستان ایکسپریس** دہلی کا

جس نے جدید ادب کے شمارہ نمبر ۱۲ پر پابندی کی روداد کو **اثبات** سے لے کر شائع کیا اور جب ''پرویزی حیلوں کی روداد'' مضمون کی اشاعت پر پابندی لگوائی گئی تو اس کے نتیجہ میں اس مضمون کو بھی بروقت اور اہتمام کے ساتھ شائع کیا اور ناجائز پابندی کی زنجیروں کو توڑنے میں حق کا ساتھ دیا۔

ترتیب

ابتدائیہ

ساختیات اور پسِ ساختیات کے مباحث جب میرے مطالعہ میں آئے تھے تو سچی بات ہے کہ انہیں سمجھنے کے لیے خاصی دماغ سوزی کرنا پڑتی تھی۔تاہم ایک نئے تنقیدی ڈسپلن کے طور پر میں نے نہ تو اس کی بے جا مخالفت کی اور نہ ہی اسے للچائی ہوئی نظروں سے دیکھا۔شروع میں جب ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب نے اسے یہودیوں کی سازش قرار دیا تو مجھے ان کی اس بات سے افسوس ہوا۔تب میرے ذہن میں وہ عمومی پاکستانی رویہ تھا جس کے باعث ہم ہر معاملہ میں سازشی تھیوری لے آتے ہیں۔تاہم جیسے جیسے اس ساختیات اور پسِ ساختیات کے اسرار تھوڑے بہت منکشف ہوتے گئے، ویسے ویسے مجھے ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب کی بات میں وزن محسوس ہوتا گیا۔میں نے پاکستان میں ڈاکٹر وزیر آغا صاحب سے ذاتی ملاقاتوں میں اس تنقیدی ڈسپلن کو آسان الفاظ میں سمجھنے کی کوشش کی۔کچھ پلے پڑا، کچھ پلے نہیں پڑا۔

دہلی میں قیام کے دوران جب دیوندر اسر صاحب سے ملاقاتیں ہوئیں تو ان کے ذریعے مجھے اس ڈسپلن کو نسبتاً بہتر طور پر جاننے کا موقعہ ملا اور اس کا کچھ اچھا تاثر نہیں بنا۔تخلیق میں سے مصنف کو منہا کرنا جدیدیت کا خاصا تھا۔اس کا یہ پہلو مناسب تھا کہ کسی فن پارے پر بات کرتے ہوئے اس کے مصنف کی ذاتی حیثیت اور مرتبہ اثر انداز نہ ہو۔اور مطالعہ غیر جانبدارانہ ہو سکے۔لیکن مابعد جدیدیت مصنف کو منہا نہیں کر رہی تھی باقاعدہ موت کے گھاٹ اتار رہی تھی۔مصنف کی موت کے اعلان کے ساتھ متن کو بھی غیر اہم کہا جا رہا تھا اور اہمیت دی جا رہی تھی اس نام نہاد قاری کو جو دراصل مابعد جدید نقاد تھا۔ایسا نقاد جو خود تخلیقی لحاظ سے بانجھ تھا وہ تخلیق کاروں اور تخلیقات کو بے توقیر کر کے اپنے فرمودات کو ہی ادبِ عالیہ قرار دلوانا چاہ رہا تھا۔میں نے اسی زمانے میں اپنے ایک دو مضامین میں بھی اور رسائل میں چھپنے والے خطوط میں بھی اس رویے کی شدید مخالفت کی۔

اس حوالے سے میرے ان دو پرانے اقتباسات سے مابعد جدیدیت کے تعلق سے میرے مطالعہ اور میری سوچ کو کسی حد تک سمجھا جا سکتا ہے:

۱۔"ساختیاتی ناقدین اس ڈسپلن کو مشکل، گنجلک اور ژولیدہ انداز میں بیان کرنے کی بجائے اگر عملی تنقید کے نمونے پیش کریں تو زیادہ بہتر ہے۔نارنگ صاحب نے اس سلسلے میں اولیت کا اعزاز حاصل کیا ہے۔ان کا مضمون "فیض کو کیسے نہ پڑھیں" ساختیاتی عملی تنقید کا شاندار نمونہ ہے۔ایک طرف قاری کی آزادی کا احساس اتنا شدید ہے کہ مصنف کو موت کے گھاٹ اتارنا ضروری ہے۔دوسری طرف بحیثیت ناقد ہدایت نامہ جاری کیا جا رہا ہے کہ فیض کو کیسے پڑھیں اور کیسے نہ پڑھیں۔

گستاخی معاف۔ادبی سطح پر یہ قاری کی آڑ میں تخلیقی لحاظ سے بانجھ نقادوں کی ادب پر مسلط ہونے کی ایک چال ہے اور عالمی سطح پر بعض امریکی دانشوروں کے احساسِ کمتری کی نفسیاتی تسکین۔"

(خط مطبوعہ سہ ماہی **دستک** ہوڑہ، شمارہ نمبر ۳، جولائی تا دسمبر ۱۹۹۴ء۔صفحہ نمبر ۲۳۶، ۲۳۷)

۲۔"جیسے ہی ہمارے یہاں ساختیاتی (اور ساخت شکن) تنقید کے چرچے ہونے لگے، بے معنی تحریروں میں خود ساختہ معنویت باور کرانے والے ناقدین اور شارحین کی بن آئی۔میں اس نئے تنقیدی ڈسپلن کو بھی ایک جزوی سچائی سمجھتا ہوں لیکن ہمارے ایسے ناقدین جو تخلیقی صلاحیت سے عاری تھے انہیں یہ تنقیدی ڈسپلن کچھ زیادہ ہی راس آنے لگا۔انہوں نے سوچا کہ جب ہم کسی بے معنی، بے تکی تحریر میں معانی کے صد رنگ جلوے پیدا کر لیتے ہیں تو پھر سارا کمال تو ہمارا اپنا ہوا۔ تخلیق کیا اور تخلیق کار کیا!___ چنانچہ قاری کی آڑ لے کر تخلیقی لحاظ سے بانجھ ناقدین نے تخلیق کار کو تخلیق سے اس طرح نکال باہر کیا جیسے مکھن میں سے بال___ تخلیق کار کو اپنی ہی تخلیق کے قاری ہونے کے حق سے بھی محروم کر دیا گیا۔یہ کھیل تماشہ ابھی جاری ہے۔کبھی ادب کی ٹوپی سے خرگوش نکال کر دکھائے جا رہے ہیں اور کبھی رومال میں سے کبوتر برآمد ہو رہے ہیں۔یار لوگ تماشے سے فارغ ہوں گے تو انہیں احساس ہوگا کہ ادب تو تخلیق کار، تخلیق اور قاری کے مابین ایک توازن قائم کرتا ہے۔"

(دیوندراسر کے ناولٹ **خوشبو بن کے لوٹیں گے** پر لکھے گئے مضمون کا اقتباس۔مطبوعہ ماہنامہ **اوراق** لاہور، شمارہ :فروری مارچ ۱۹۹۵ء۔**عالمی اردو ادب** دہلی۔شمارہ: ۱۹۹۵ء دیوندراسر نمبر)

ایک اور نکتہ جو میرے لیے تشویش کا باعث رہا وہ یہ تھا کہ مابعد جدید تصورات کے مطابق مصنف اور تخلیق دونوں کی بے وقعتی کے نتیجہ میں ان مذہبی آسمانی کتابوں کی بھی تکذیب ہوتی تھی جن کو ان کے ماننے والے مقدس درجہ دیتے ہیں، نہ صرف الہامی کتابوں کے متن کی نفی یا بے وقعتی ہوتی تھی بلکہ ان کے (مصنف) نازل کرنے والے خدا کی بھی نفی ہوتی تھی۔مابعد جدیدیت کے اس بنیادی نکتہ کو سمجھ لینے کے بعد میرے لیے اس ڈسپلن کی وہی حیثیت ہوگئی جو بہت پہلے ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب بیان کر چکے تھے۔

اس سب کچھ کے باوجود یہ سارے مباحث ایک علمی و ادبی دائرے میں چل رہے تھے۔ جب دہریوں سے مکالمہ ہو سکتا ہے تو مابعد جدید دانشوروں سے بھی مکالمہ کیا جا سکتا ہے۔یہاں تک سارا اختلاف اور اتفاق علم و ادب کی سطح تک تھا۔

لیکن جب ڈاکٹر گوپی چند نارنگ صاحب کی ''**تصنیف**'' ''ساختیات، پسِ ساختیات اور مشرقی شعریات'' کے سرقے سامنے آئے تو بات مابعد جدیدیت کے مسئلہ سے ہٹ کر سرقہ یا اوریجنل کے نکتہ پر آ گئی۔اس سلسلہ میں جدید ادب کے شمارہ نمبر ۹ (جولائی تا دسمبر ۲۰۰۷ء) میں عمران شاہد بھنڈر کا مضمون شائع کرتے ہوئے میں نے یہ نوٹ درج کیا:

''عمران شاہد بھنڈر برمنگھم یونیورسٹی سے Postmodern Literary Theory کے موضوع پر پی ایچ ڈی کر رہے ہیں۔اس مضمون کا جواب گوپی چند نارنگ صاحب کو خود دینا چاہیے۔ان کے جواب کا انتظار رہے گا۔یہ مضمون ماہنامہ **نیرنگِ خیال** کے سالنامہ ۲۰۰۶ء میں چھپ چکا ہے تاہم اب عمران شاہد نے اس میں مزید اضافے کیے ہیں اور یہ مضمون پہلے سے دوگنا ہو گیا ہے۔سو یہ اپ ڈیٹیڈ مضمون **جدید ادب** میں شائع کیا جا رہا ہے۔**ح۔ق**''

جدید ادب کے شمارہ نمبر ۹، ۱۰ اور ۱۱ میں سرقوں کی نشاندہی کرنے والے تین مضامین شائع کیے گئے لیکن ڈاکٹر گوپی چند نارنگ صاحب نے ان کا کوئی جواب نہیں دیا۔شمارہ نمبر ۱۲ جب چھپ

رہا تھا تو اس میں نارنگ صاحب کے سرقوں کی نشان دہی کرنے والا کوئی مضمون شامل نہیں تھا۔لیکن انہوں نے اچانک شدید ردِ عمل ظاہر کرتے ہوئے میرے پبلشر کرم فرما پر دباؤ ڈال دیا اور تقاضا کیا کہ خطوط کے صفحات پر جو تھوڑا بہت ان کے سرقوں پر رائے دی گئی ہے اسے بھی حذف کیا جائے۔(اس قصہ کی روداد کے لیے اسی کتاب کے صفحہ نمبر ۱۷ پر درج میرا مضمون ''جدید ادب کے شمارہ نمبر ۱۲ کی کہانی'' ملاحظہ فرمایئے۔)

گوپی چند نارنگ صاحب شمارہ نمبر ۱۲ کے خطوط پر غیر ضروری ردِ عمل ظاہر کر کے سنسر شپ عائد نہ کرتے تو **جدید ادب** میں ایسا کوئی مضمون ویسے بھی شائع نہیں ہونا تھا۔تاہم ان کی سنسر شپ کے بعد مجھے اس کی روداد لکھنا پڑی۔اس روداد کے بعد میں نے صبر کر لیا تھا۔لیکن ڈاکٹر نارنگ صاحب اپنی سنسر شپ کی روداد چھپنے پر بھی سخت ناراض ہوئے۔اس کے جواب میں انہوں نے لندن کے ایک فارسی چور نقاد سے میرے خلاف ایک نہایت غلیظ اور ذلیل قسم کا مخالفانہ مضمون لکھوایا۔اس مضمون کی ویسے اشاعت پر بھی ہم لوگوں نے کسی ردِ عمل کا اظہار نہیں کیا کیونکہ نہ اس مضمون کی کوئی وقعت تھی اور نہ ان فورمز کی جہاں سے اسے شائع کیا گیا تھا۔

تاہم جب اس انتہائی بے ہودہ مضمون کو نصرت ظہیر صاحب کے ادبی رسالہ **ادب ساز** میں شائع کیا گیا تو پھر میرے دوستوں نے پوری طرح میرا ساتھ دیا۔ارشد خالد نے **عکاس** کا گوپی چند نارنگ نمبر نہ صرف شائع کیا بلکہ بہت مختصر عرصہ میں ایک معیاری نمبر شائع کر دکھایا۔یہ نارنگ صاحب کی اس حرکت کا مدلل اور علمی جواب تھا جو انہوں نے مذکورہ بے ہودہ مضمون کو **ادب ساز** میں شائع کرانے کی صورت میں کی تھی۔یہاں یہ ذکر بے محل نہ ہوگا کہ نصرت ظہیر صاحب ایک طرف یہ سمجھتے ہیں کہ جب وہ ادبی سطح سے انتہائی گرا ہوا مضمون انہیں بھیجا گیا تو نارنگ صاحب نے انہیں اس کی اشاعت کے لیے نہیں کہا تاہم وہ یہ بھی باور کرتے ہیں کہ نارنگ صاحب کو اس سب کا علم رہا ہوگا۔جیسا کہ ان کے اپنے الفاظ ہیں:

''آپ نے مجھ سے کہا تھا کہ اس مضمون کے پیچھے نارنگ صاحب کا ہاتھ ہے۔میں نے کہا میں بھی یہی سمجھتا ہوں۔میں نے شاید یہ بھی کہا کہ میں جانتا ہوں۔''

یہاں مجھے صرف اتنا کہنا ہے کہ اگر نارنگ صاحب نے یہ مضمون لکھوایا اور **ادب ساز** میں چھپوایا تو انہوں نے خود **عکاس** کے نارنگ نمبر کی اشاعت کا بندوبست فرما لیا۔ اگر نارنگ صاحب کا اس میں کوئی عمل دخل نہیں ہے تو پھر **عکاس** کے نارنگ نمبر کا ثواب نصرت ظہیر صاحب کو ملنا چاہیے۔

عکاس کے نارنگ نمبر کی اشاعت کے بعد پوری دنیا میں اس کی پذیرائی ہوئی۔ مفادات کے اسیر گنتی کے چند لوگوں نے نارنگ صاحب کا دفاع کرنا چاہا لیکن کوئی ایک شخص بھی سرقوں کے ڈھیر سارے اقتباسات کے ٹھوس ثبوتوں کا کوئی علمی اور مدلل جواب پیش نہ کر سکا۔

اس کتاب کی اشاعت کا کریڈٹ بھی ڈاکٹر گوپی چند نارنگ صاحب ہی کو دیا جانا چاہیے۔ **عکاس** کے نارنگ نمبر کا کوئی علمی جواب جب بھی آئے گا اس کا خیر مقدم کیا جائے گا۔ لیکن اس کے بعد نارنگ صاحب نے سرقوں کا انکشاف کرنے والے دوست عمران شاہد بھنڈر کے مقابلہ میں ارشد خالد مدیر **عکاس** کو اور ان کے مقابلہ میں مجھے زیادہ زد پر رکھ لیا۔ ان کے کارندوں نے کسی دلیل کی بجائے گالی اور الزام تراشی کی زبان میں مہم شروع کر دی۔ کبھی کوئی بے ہودہ الزام لگایا جا رہا ہے، کبھی کوئی حیلہ سازی کی جا رہی ہے۔ اس ساری مہم جوئی کے نتیجہ میں مجھے ہر بار مبینہ الزام کے سلسلہ میں نہ صرف اپنی صفائی دینا پڑی بلکہ حقیقت کو اس طور آشکار کرنا پڑا کہ نارنگ صاحب کی ادبی سیاست کا طریقۂ واردات کھل کر سامنے آتا چلا گیا۔ یوں اس کتاب میں شامل بنیادی مضامین لکھوانے کا سہرا بھی ڈاکٹر گوپی چند نارنگ صاحب کے سر بندھتا ہے۔ میرے مضامین دفاع کا حق استعمال کرتے ہوئے جواب کے طور پر لکھے گئے ہیں۔ گویا یہ مجادلہ میں نے نہیں کیا، مجھ پر مسلط کیا گیا۔ اور جب یہ مجادلہ مجھ پر مسلط کیا گیا تو میں نے اس معرکے میں ہر بات پوری دلیل، ٹھوس ثبوت، پورے شواہد اور علمی و ادبی سلیقے کے ساتھ کی۔ الزامات کے جواب دینے کے ساتھ میں نے ہر بار بحث کو نارنگ صاحب کے سرقوں کے موضوع پر فوکس کیا۔ کیونکہ ان کے تمام حامی نارنگ صاحب کے سرقوں کے موضوع سے فرار کے لیے ہی حیلہ جوئیاں کر رہے تھے۔

اس سب کے باوجود نارنگ صاحب نے اگست کے مہینہ میں رمضان شریف کے دنوں میں پھر ایک ایسا ذلیل مضمون لکھوا کر شائع کرایا کہ اس کے جواب میں پھر یہ ساری بحث کتابی صورت

میں چھپوانا ناگزیر ہو گئی۔ ہر چند اس بار نارنگ صاحب نے ابھی **ادب ساز** جیسے کسی جریدہ میں یہ مضمون نہیں چھپوایا تاہم ان کی ادبی سیاست کے طریقۂ واردات کو سمجھ لینے کے بعد ان کی اس حرکت کا اب فوری نوٹس لینا ناگزیر ہو گیا تھا۔ ہم کبھی بھی کسی ذلیل ترین شخص کی سطح تک نہیں اتریں گے لیکن جب بھی نارنگ صاحب نے ایسے لوگوں کی خدمات حاصل کیں، اس کا جواب براہِ راست نارنگ صاحب کو دیا جائے گا۔ **عکاس** کا نارنگ نمبر بھی ایسا ہی جواب تھا اور اب میری یہ کتاب بھی ویسا ہی جواب ہے۔ میں نارنگ صاحب سے وعدہ کرتا ہوں کہ وہ میرے خلاف یا اس کارِ خیر میں میرے ساتھیوں میں سے کسی کے خلاف، جب بھی کسی ارذل شخص سے غلاظت اچھالنے کی خدمت لیں گے انہیں بالکل اسی طرح خراجِ تحسین پیش کیا جائے گا جیسا **عکاس** کے نارنگ نمبر کی صورت میں کیا جا چکا ہے اور جیسا اب میری اس کتاب کی صورت میں کیا جا رہا ہے۔ ہمارے موقف اور ہمارے دلائل میں سچائی کی کتنی طاقت ہے، یہ بات نارنگ صاحب سے زیادہ کون جان سکتا ہے۔

نارنگ صاحب کی ''**تصنیف**'' ''ساختیات، پسِ ساختیات اور مشرقی شعریات'' اردو ادب کی تاریخ کا سب سے بڑا سرقہ ہے۔ یہ کسی شعر کے توارد، کسی غزل یا نظم کے مضامین مل جانے کی بات نہیں۔ کسی اکا دکا نثری اقتباس سے فیضیاب ہونے والوں جیسی صورت بھی نہیں۔ یہ بڑے سوچے سمجھے انداز میں اور بڑی کاری گری کے ساتھ کیا گیا بہت بڑا علمی و ادبی ڈاکہ ہے۔ جو اردو دنیا کے لیے دہری ذلت کا موجب ہے۔ ایک اس لیے کہ نارنگ صاحب نے اپنی علمی دھاک بٹھانے کے لیے یہ سارا سرقہ اردو زبان میں پیش کیا۔ دوسری ذلت اس لیے کہ انہیں اردو والوں کی جہالت اور مفاد پرستی کے باعث پورا اطمینان تھا کہ ان کے سرقے کبھی بھی پکڑے نہیں جا سکیں گے۔ یہ دو ذلتیں تو نارنگ صاحب کی طرف سے عطا کی گئی تھیں لیکن تیسری ذلت خود مفادات کے اسیر وہ اردو والے اردو کے ماتھے پر لگا رہے ہیں جو سرقوں کے سارے اقتباسات کو آمنے سامنے رکھ کر پرکھنے اور پھر کسی نتیجہ پر پہنچنے کی بجائے اندھا دھند نارنگ صاحب کی حمایت کر کے اپنی جہالت کا اقرار کیے جا رہے ہیں۔

نارنگ صاحب کے سرقوں سے توجہ ہٹانے والے مجادلہ والے مضامین کے علاوہ میں نے مابعد جدیدیت کے سلسلہ میں اپنی چند پرانی تحریریں اور ایک مکالمہ کو بھی اس کتاب میں شامل کرلیا ہے۔اور آخر میں عمران شاہد بھنڈر کے چار مضامین میں شامل ان اقتباسات کو یکجا کر دیا ہے جن کے متوازی اصل کتابوں کے اقتباس درج ہیں۔اس طرح غیر جانبدار قارئین کو حقیقت تک رسائی میں آسانی ہوجائے گی اور وہ اصل کتابوں کے ذریعے سچ اور جھوٹ کو پرکھ سکیں گے۔

اردو دنیا کی اس معرکہ آرائی کی خبریں ہندی اور انگریزی پریس تک بھی پہنچی ہیں۔اس سلسلہ میں چودھری محمد نعیم صاحب کے انگریزی کے دو مضامین نے اہم کردار ادا کیا ہے۔میں ان کے دونوں مضامین اور ان پر آنے والے ردِعمل کا ایک مختصر سا انتخاب بھی اس کتاب میں شامل کر رہا ہوں۔

مجھے معلوم ہے کہ اس معرکہ میں ابھی میں اور میرے دوچار دوست بہت اکیلے ہیں۔تاہم مجھے یہ بھی یقین ہے کہ ہم نے جو حق اور سچ کی جنگ لڑی ہے اس میں بے سروسامانی کے باوجود ہمارا موقف سو فیصد درست ہے۔ڈاکٹر گوپی چند نارنگ صاحب کی زندگی بھر کی پبلک ریلشنتگ دھری کی دھری رہ جائے گی اور ہمارا یہ موقف اردو ادب کی تاریخ میں نہ صرف محفوظ رہے گا بلکہ اسی کی بنیاد پر نارنگ صاحب کے علمی قد وقامت کا تعین ہوگا۔

آخر میں شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں ان تمام دوستوں کا جنہوں نے کسی نہ کسی طور میرے ساتھ تعاون کر کے میری حوصلہ افزائی کی،میری ہمت بندھائی۔جنہوں نے ممکنہ حد تک میرا ساتھ دیا۔خاص طور پر پاکستان سے ڈاکٹر ظہور احمد اعوان،احمد ہمیش،نعیم الرحمٰن،کاوش عباسی اور احمد حسین مجاہد کا،انڈیا سے شمیم حنفی،جگدیش پرکاش،منیشا سیٹھی،علی جاوید،وسیم راشد،تنہا تماپوری اور مطیع الرحمٰن عزیز کا،امریکہ سے چودھری محمد نعیم اور محمد عمر میمن کا،کینیڈا سے عبداللہ جاوید اور رشید ندیم کا،ہالینڈ سے احسان سہگل اور ناصر نظامی کا،فرانس سے مبشر سعید کا،اٹلی سے جیم فے غوری کا،جرمنی سے خالد ملک ساحل اور راجہ محمد یوسف کا اور انگلینڈ سے ساقی فاروقی،جمیل الرحمٰن،حمیدہ معین رضوی،شبانہ یوسف،نصیر حبیب اور اقبال نوید کی ہمت افزائی کا خصوصی شکریہ ادا کرتا ہوں۔

خدا سب کو خوش رکھے۔

حیدر قریشی (جرمنی سے) ۹ رستمبر ۲۰۰۹ء

ادارتی نوٹ

گوپی چند نارنگ مصنف یا مترجم؟

عمران شاہد بھنڈر کا گوپی چند نارنگ کی کتاب ''ساختیات، پسِ ساختیات اور مشرقی شعریات'' کے اصل مآخذات کے انکشاف کے حوالے سے یہاں دوسرا (جوابی) مضمون دیا جارہا ہے۔پہلا مضمون 'جدید ادب' شمارہ نمبر ۹ میں شائع ہو چکا ہے۔ جدید ادب کے گزشتہ شمارہ میں عمران شاہد بھنڈر کا مضمون شائع کرتے ہوئے میں نے بڑی صراحت کے ساتھ لکھا تھا کہ اس مضمون کا جواب گوپی چند نارنگ صاحب کو خود دینا چاہئے۔کیونکہ عمران شاہد بھنڈر کے ساتھ طے ہوا تھا کہ دوسرے شاعروں،ادیبوں اور قارئین کا ردِعمل تو شائع کیا جائے گا لیکن مضمون کا اصل جواب صرف ڈاکٹر گوپی چند نارنگ صاحب کی طرف سے آنے پر ہی شائع کیا جائے گا۔نارنگ صاحب نے تاحال جواب دینے کی زحمت نہیں فرمائی۔عام معترضین کے جواب میں خاموشی شانِ استغناء ہوسکتی ہے لیکن علمی سطح پر سرقہ کا مدلل الزام سر پر پڑا ہو تو ایسی صورت میں خاموشی معنی خیز ہی نہیں بلکہ مجرمانہ ہوجاتی ہے۔

اس دوران برادرِ عزیز جاوید حیدر جوئیہ صاحب نے میری طرف سے رائے پوچھنے پر پورا مضمون عنایت کر دیا۔اصولاً مجھے صرف نارنگ صاحب کا جواب چھاپنا تھا[اب بھی ان کے ہی جواب کو چھاپنا چاہتا ہوں،جس میں وہ بطور خاص مغربی کتابوں سے بغیر حوالے کے ترجمہ (سرقہ) کرنے کے اپنے فعل کے بارے میں وضاحت فرمائیں]۔اب جاوید حیدر جوئیہ صاحب کا جواب چھاپنا میرے لئے ذاتی طور پر واجب ہوگیا تو عمران شاہد بھنڈر صاحب سے اس کا جواب مانگنا بھی لازم ہوا۔سو دونوں ردِعمل قارئین کی خدمت میں پیش ہیں۔

عمران شاہد کے مضمون پر قارئین ادب کا جو مختصر ردِعمل سامنے آیا ہے اسے خطوط کے صفحات میں شامل کیا ہے۔یہاں ان پانچ مکتوب نگاروں سے معذرت کرنا بھی ضروری ہے جنہوں نے مختصر ردِعمل میں کچھ غیر متعلق باتیں چھیڑ کر نارنگ صاحب کی ذات کو ہدف بنالیا۔میں نے وہ پانچ

خطوط شائع نہیں کئے۔ایسے ایک مکتوب میں ''حالی کے بعد والے کی علمی بدحالی'' کے الفاظ نرم ترین الفاظ کہے جا سکتے ہیں۔اصلاً عمران شاہد نے نارنگ صاحب کو بلاحوالہ ترجمہ کے شائستہ الفاظ سے ملزم کیا تھا لیکن ان کے غیر ضروری دفاع کے نتیجہ میں اب براہ راست سرقہ کی بات ہونے لگی ہے۔گوپی چند نارنگ کے دفاع سے انکار کرتے ہوئے ان کا دفاع کرنے والے جاوید حیدر جوئیہ صاحب کے مضمون کا مجموعی تاثر میرے نزدیک یہ بنا کہ نارنگ صاحب کی غلطی کا ہلکا سا اقرار کر کے پھر اسے جلدی میں حوالہ نہ دے سکنے اور صفحات کی نمبرنگ نہ دے پانے سے جوڑ کر بے ضرر غلطی بنا دیا۔اس کے بعد مضمون کی روح اور اصل کو چھوڑ کر فروعات میں بحث کو الجھا دیا، تا کہ نارنگ صاحب کے بلاحوالہ تراجم/سرقہ سے توجہ ہٹ جائے۔ جہاں تک دوسرے اشوز کا تعلق ہے ذاتی طور پر میں عمران شاہد کے مقابلہ میں جاوید حیدر جوئیہ سے زیادہ قریب ہوں۔لیکن یہاں ان پر ساری توجہ مرکوز کرنا نفسِ مضمون ''بلاحوالہ ترجمہ/سرقہ'' کی طرف سے توجہ ہٹا کر در حقیقت دوسرے مباحث میں الجھا دینا ہے۔اگر جوئیہ صاحب ایسا کچھ لکھتے کہ'' **نارنگ صاحب کے جو اقتباسات دیئے گئے ہیں وہ حیران کن ہیں اور بے شک انہیں ان کے بارے میں وضاحت کرنی چاہئے کہ ایسا کیسے ہو گیا ہے۔اس سلسلہ میں انہیں کی وضاحت سے ہی اصل معاملہ واضح ہو گا۔تاہم میں اس مضمون سے قطع نظر کرتے ہوئے عمران شاہد کے دوسرے مندرجات پر توجہ دینا چاہتا ہوں**''، تو ایسے جواب کے لئے عمران شاہد سے جواب حاصل کرنے کی ضرورت پیش نہ آتی۔عمران شاہد کے جوابی مضمون کے سلسلہ میں بھی یہ عرض کر دوں کہ میرے نزدیک جاوید حیدر جوئیہ خود پڑھے لکھے آدمی ہیں اور ان کا مشیروں کا کوئی ایسا معاملہ نہیں ہے جیسا عمران شاہد نے لکھا ہے۔چونکہ دونوں طرف تھوڑا بہت غصہ ظاہر ہوا ہے تو غبار نکالنے کے لئے دونوں تحریریں پیش خدمت ہیں۔اس یقین کے ساتھ کہ دونوں طرف سے تلخی تدریجاً کم ہو گی اور نارنگ صاحب کے بلاحوالہ تراجم/سرقہ کے بارے میں غیر ضروری الزام تراشی اور غیر ضروری دفاع دونوں سے گریز کر کے حقیقت کو کھل کر سامنے آنے دیا جائے گا۔بہر حال یہ بحث اب جس رنگ میں بھی چل نکلی جدید ادب کے صفحات حاضر ہیں۔

عمران شاہد کے بارے میں یہاں بتاتا چلوں کہ انہوں نے ۲۰۰۴ء میں یونیورسٹی آف سینٹرل انگلینڈ، برمنگھم سے ''انٹرنیشنل براڈ کاسٹ جرنلزم'' میں ایم اے کی ڈگری حاصل کی۔اس کے بعد ۲۰۰۶ء میں انہوں نے اسی یونیورسٹی سے ''انگلش لٹریری سٹڈیز'' میں ایم اے کی دوسری ڈگری حاصل کی۔عمران بھنڈر نے اپنا مختصر مقالہ جرمن فلسفی عمانوئیل کانٹ کے فلسفہ جمالیات پر تحریر کیا اور فائنل مقالہ بیسویں صدی کی روسی تنقید پر لکھا جس میں انہوں نے لیون ٹراٹسکی کے نظریہ ادب کا ہیئت پسندوں کے نظریات سے تقابلی جائزہ لیا۔اس وقت وہ پی ایچ ڈی کے مقالے پر کام کر رہے ہیں۔جدید ادب کے شمارہ نمبر ۹ میں شائع شدہ ان کا مضمون عکاس اسلام آباد شمارہ ۶ میں مزید اقتباسات کے اضافوں کے ساتھ چھپا ہے۔یہ سارے اضافے مغربی مصنفین کے مزید بلاحوالہ تراجم یا سرقہ (اصل میں دونوں ایک ہیں) کی نشاندہی کرتے ہیں۔اس شمارہ میں جو اقتباسات شامل ہیں وہ جدید ادب ۹ اور عکاس ۶ والے اقتباسات کے علاوہ ہیں اور ابھی ایسے اقتباسات کی دریافت کا سلسلہ کہیں رکنے کا نام نہیں لے رہا۔

عمران شاہد نے اس بار یہ دعویٰ کیا ہے کہ **گوپی چند نارنگ نے ٹیرنس ہاکس کی ساری کتاب کو صرف چند ایک پیراگرافس کی ترتیب بدل کر لفظ بہ لفظ اپنے نام سے اردو میں شائع کرایا ہے۔یہ محض الزام تراشی نہیں ہے، بلکہ اردو ادب کی اعلیٰ ترین علمی سطح کی افسوسناک صورتحال ہے۔**ڈاکٹر گوپی چند کی شانِ استغناء پر مبنی خاموشی برحق ،لیکن اتنا کچھ سامنے آنے کے بعد ترجمہ یا سرقہ کے حوالے سے اپنے کئے کرائے کی انہیں خود ہی وضاحت کرنا ہو گی۔تمام سابقہ اور موجودہ سرقوں کے ساتھ ٹیرنس ہاکس کی کتاب کے حوالے سے نارنگ صاحب کو اب توجہ فرمانی چاہئے۔اگر ٹیرنس ہاکس کی کتاب میں سے دو تین پیراگراف ایسے ہوں جنہیں نارنگ صاحب نے اپنی کتاب میں ترجمہ نہ کیا ہو تو وہ یا ان کا کوئی بھی خواہ ان پیراگرافس کی نشاندہی کرے، میں ان پیراگرافس کو شامل نہ کرنے پر ان سے معذرت کروں گا۔خدا نہ کرے کہ انگلینڈ کے متعلقہ پبلشر کے علم میں یہ ساری داستان آ جائے اور وہ ڈاکٹر نارنگ صاحب کو کاپی رائٹ ایکٹ کی خلاف ورزی کا نوٹس بھیج دے۔

(مطبوعہ **جدید ادب** جرمنی۔شمارہ:۱۰۔جنوری تا جون ۲۰۰۸ء)

جدیدادب کے شمارہ نمبر۱۲ کی کہانی

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ صاحب کی مہربانی درمہربانی

جدیدادب کے شمارہ نمبر۱۲ بابت جنوری تا دسمبر ۲۰۰۹ء کی اشاعت اکتوبر ۲۰۰۸ء میں ہورہی تھی۔ جدیدادب کو عام طور پر معلنہ تاریخ سے دو ماہ پہلے چھپوانے کی کوشش کرتا ہوں تا کہ بحری ڈاک سے بیرونِ برِصغیر کے پیکٹ بروقت پہنچ جائیں۔ جدیدادب کبھی انڈیا سے چھپوالیتا ہوں، کبھی پاکستان سے۔ گزشتہ چار شمارے (نمبر ۸،۹،۱۰،۱۱) جو ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی کے مصطفیٰ کمال پاشا صاحب نے شائع کیے، وہ اشاعت کے لحاظ سے بتدریج بہترین ہورہے تھے۔ اس لیے مجھے ان کے ذریعہ ہی یہ کام کرانا اچھا لگ رہا تھا۔ ان کا کام کرنے کا انداز پروفیشنل ہے، بحیثیت پبلشر مجھے پاشا صاحب بہت اچھے لگے ہیں۔ شمارہ نمبر۱۲ کی سیٹنگ کر کے میں نے فائنل فائلز انہیں بھیج دیں۔ اکتوبر میں ہی ۲۸۸ صفحات کا رسالہ چھپ گیا، لیکن بائنڈنگ ہونے سے پہلے ڈاکٹر گوپی چند نارنگ صاحب نے پبلشر پر قانونی چارہ جوئی کا دباؤ ڈال دیا۔ پاشا صاحب کی مجبوری بجا تھی کہ وہ اشاعتی امور میں تو اچھا پروفیشنل کام کر سکتے تھے لیکن کسی قانونی جھگڑے میں الجھنا ان کے لیے ٹھیک نہ تھا۔ سو اس کے نتیجہ میں چھپا ہوا جدیدادب بائنڈنگ سے روک لیا گیا۔ نارنگ صاحب کا تقاضہ تھا کہ ان کے خلاف جدیدادب میں کچھ بھی نہیں شائع ہو۔ لیکن جدیدادب شمارہ نمبر۱۲ کی اشاعت میں ڈاکٹر نارنگ صاحب کی طرف سے ناجائز دباؤ کی روداد بعد میں، پہلے ان کی ناراضی کی وجہ جان لیں۔

جدید ادب کے شمارہ ۹، ۱۰ اور ۱۱ میں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کی شہرہ آفاق تصنیف ''ساختیات، پسِ ساختیات اور مشرقی شعریات'' کے بارے میں عمران شاہد بھنڈر کے

تین مضامین شائع ہو چکے ہیں۔ میں نے جدید ادب کے صفحات پر عمران شاہد بھنڈر کے مندرجات اور سرقہ کے سنگین الزام سے بریت کے لیے نارنگ صاحب کو کھلی پیش کش کی کہ وہ جو بھی جواب لکھیں گے، اسے من وعن شائع کیا جائے گا۔ لیکن انہوں نے جہاں خود کو **''چہ دلاور است دزدے کہ بکف چراغ دارد''** کی جیتی جاگتی مثال بنایا وہاں اب انہوں نے **''چوری اور سینہ زوری''** کا بھی کھلا ثبوت فراہم کر دیا ہے۔ علمی اختلاف رائے کسی سے بھی کیا جا سکتا ہے اور اس کے لیے دلیل سے کام لینا پڑتا ہے۔ لیکن جب جواب بن نہ پڑے تو پھر انسان اپنی سماجی و سیاسی حیثیت سے فائدہ اُٹھا کر دلیل کا جواب پتھر سے دیتا ہے۔ نارنگ صاحب نے اب یہی کیا ہے۔

جہاں دلیل کو پتھر سے توڑنا ٹھہرا
وہ شہرِ سنگ دلاں سخت امتحان میں ہے

اپنے کھلے سرقوں کا نارنگ صاحب کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ کیتھرین بیلسی، جولیا کرسٹوفر، کرسٹوفر نورس، ٹیری ایگلٹن، رامن سیلڈن، جان سٹرک، جیسے مغربی مصنفین کی کتابوں سے پیراگرافس کے پیراگرافس چوری کر لینے کا جواب نارنگ صاحب کے ذمہ ہے۔ ٹیرنس ہاکس کی کتاب Structuralism and Semiotics پیراگرافس کے معمولی سے ادل بدل کے ساتھ پوری کی پوری اپنی شاہکار ''تصنیف'' **ساختیات، پسِ ساختیات اور مشرقی شعریات** میں شامل کر لی۔ Selden, Raman کی کتاب Contemporary Literary Theory سے اتنے صفحات چوری کیے کہ ہر اقتباس کے ساتھ سرقہ شدہ اقتباس دینا محال ہو گیا۔ سرقہ کی نشاندہی کے لیے جدیدادب شمارہ ۱۱ کے صفحہ نمبر ۸۰ پر اصل کتاب اور نارنگ صاحب کی شاہکار کتاب کے صفحات نمبرز کی نشاندہی پر اکتفا کرنا پڑا۔ مذکورہ سرقہ شدہ صفحات کا یہاں بھی حوالہ دے دیتا ہوں۔

رامن سیلڈن کی کتاب کے صفحات	گوپی چند نارنگ کی کتاب کے سرقہ شدہ صفحات
۲۷ تا ۴۲	۷۹ تا ۱۰۶
۴۹ تا ۷۰	۲۸۸ تا ۳۲۹
۱۴۹ تا ۱۵۸	۲۳۴ تا ۲۴۰

۸۶تا۱۰۳ ۲۴۳تا۲۶۷

جس کتاب کی پیشانی پراس قسم کے الفاظ جگمگا رہے ہوں:

''پروفیسر نارنگ کی اب تک کی علمی وادبی کتابوں میں سب سے وقیع اور فکر انگیز کام''

''نئی ادبی تھیوری ساختیات،پسِ ساختیات اور ردِتشکیل کا مکمل اور مستند تعارف اور تجزیہ''

اور جس کا علمی پوسٹ مارٹم شرمناک سرقوں کو کھول کر سامنے لے آئے،اس کے بعد نارنگ صاحب نے اپنا دفاع تو کیا کرنا تھا،جدید ادب کی اشاعت میں رخنہ ڈالنے کی سازش شروع کر دی۔یہاں یہ مان لینا چاہیے کہ **ساختیات،پسِ ساختیات اور مشرقی شعریات** نارنگ صاحب کی اب تک کی علمی و ادبی کتابوں میں سب سے اہم کتاب ہے۔اگر اس کتاب کو عمران شاہد بھنڈر نے مغربی کتابوں کا سرقہ ثابت کر دیا ہے تو نارنگ صاحب کی باقی کتابوں کی کیا اہمیت رہ جاتی ہے؟اور ان کی یہ شاہکار ''تصنیف'' تو ''نئی ادبی تھیوری ساختیات،پسِ ساختیات اور ردِتشکیل کا مکمل سرقہ'' ثابت ہو چکی ہے۔

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ صاحب سارق تو اتنے دلیر ہیں ہی کہ چراغ ہتھیلی پر لے کر سرقہ کر چکے ہیں اور یہ بھول گئے کہ اس سائبر ایج میں کہیں بھی کچھ چھپا ہوا نہیں رہ گیا۔لیکن وہ چوری کے ساتھ سینہ زوری بھی کر رہے ہیں اور اس میں بھی انہیں امتیاز حاصل ہو گیا ہے۔

جدید ادب کے شمارہ نمبر ۸ سے لے کر شمارہ نمبر ۱۱ تک سب ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس ،دہلی والوں نے شائع کیے اور بڑے اچھے طریقے سے شائع کیے۔شمارہ نمبر۱۲،بھی اشاعت کے لیے انہیں بھیجا گیا۔رسالہ شائع ہو گیا لیکن اس کو ریلیز کرنے میں نارنگ صاحب رکاوٹ بن گئے۔پہلے کہا گیا کہ اس شمارہ میں سے نارنگ صاحب کے خلاف میٹر کو حذف کیا جائے۔میں نے بتایا کہ اس شمارہ میں نارنگ صاحب کے سرقوں کی نشاندہی کرنے والا کوئی مضمون شامل نہیں ہے البتہ بعض قارئین نے اپنا ملا جلا ردِعمل دیا ہے۔نارنگ صاحب سے کہیں کہ اس بار اسے برداشت کر لیں۔آئندہ یا آپ کی مجبوری کا خیال رکھوں گا یا پھر کوئی اور پبلشر ڈھونڈ لوں گا۔لیکن پاشا صاحب کی طرف سے اصرار رہا کہ ایسا میٹر بھی حذف کیا جائے۔چنانچہ مجھے خطوط کے صفحات پر

شامل تمام خطوط میں سے وہ حصے حذف کرنا پڑے جن میں قارئین ادب نے نارنگ صاحب کے سرقوں کی داد دی تھی۔اس کے نتیجہ میں ڈیڑھ صفحات سے کچھ کم خالی جگہ بچ گئی۔صفحہ کی بچی ہوئی جگہ پر میں نے یہ نوٹ دے دیا

ضروری نوٹ: آخری مرحلہ میں خطوط کے صفحات میں سے محترمہ حمیدہ معین رضوی صاحبہ کا خط اشاعت سے روکنا پڑا۔دیگر خطوط میں بھی بہت سے حصے حذف کرنا پڑے۔وجہ۔۔۔ابھی ناگفتنی ہے۔قارئین کرام دعا کریں کہ اب رسالہ جرمنی سے ہی شائع کرنے کے قابل ہو جاؤں۔۔۔پھر آزادیٔ اظہار کا کوئی مسئلہ درپیش نہ ہوگا۔انشاء اللہ!۔۔۔آخری مرحلہ کی سنسر شپ کے باعث اس شمارہ کا ایک صفحہ خالی بچ گیا تو اس پر اپنی دو تازہ غزلیں شامل کر رہا ہوں۔

حیدر قریشی

اور ایک صفحہ پر اپنی دو تازہ غزلیں شامل کر دیں۔ان غزلوں میں پہلی غزل کا مطلع یہ تھا:

جتنے سیاہ کار تھے نردوش ہو گئے
ہم سر جھکا کے شرم سے خاموش ہو گئے

آخری سولہ صفحات کی ان پیج فائل فائنل کر کے پاشا صاحب کو بھیج دی تو بعد میں اس مطلع کی وجہ سے خیال آیا کہ نارنگ صاحب غزل کے اس مطلع کو بھی خود پر نہ محمول کر لیں۔چنانچہ میں نے پھر از خود اس غزل کو حذف کر کے ایک اور غزل شامل کر دی۔اور پاشا صاحب کو بھی لکھ دیا کہ اس وجہ سے یہ غزل بھی حذف کر رہا ہوں۔اتنی احتیاط کے باوجود میں نے پاشا صاحب سے کہا کہ اب اگر شمارہ ۱۲ میں کہیں نارنگ صاحب کے بارے میں کچھ ہلکا پھلکا سا لکھا ہوا رہ گیا ہو تو انہیں کہئے کہ اسے برداشت کر لیں۔چنانچہ خطوط کے صفحات کی فائل کے سولہ صفحات کی کاپی دوبارہ اشاعت پذیر ہوئی۔رسالہ کی جلد بندی ہو گئی اور ایک بار پھر ''آزادیٔ اظہار'' کے علمبردار ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے اپنی سنسر شپ کا فیصلہ صادر کر دیا کہ اس میں دہلی یونیورسٹی کے علی جاوید صاحب کا جو خط

شامل ہے، اسے بھی حذف کرایا جائے۔ یہ انتہائی تکلیف دہ سنسر شپ تھی لیکن میں نہ صرف اس کے لیے بھی راضی ہو گیا بلکہ ایک روز پہلے ۲۷ ر اکتوبر کو موصول ہونے والے سلیم آغا قزلباش کے ایک خط کا اقتباس متبادل کے طور پر بھیج دیا۔

سلیم آغا کا اضافہ کردہ خط جو علی جاوید کے خط کو حذف کر کے شامل کرنا پڑا وہ یہاں پیش ہے:

جدید ادب کا شمارہ نمبر ۱۱ نظر نواز ہوا۔ تازہ شمارے کے مشمولات سے بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ اردو ادب کی متعدد اصناف نظم و نثر کو مذکورہ شمارے میں جگہ دی گئی ہے تاہم انشائیہ کی عدم موجودگی نے تشنگی کا احساس دلایا۔ آپ خود بھی معیاری انشائیے باقاعدگی سے لکھتے رہے ہیں، اس حوالے سے انشائیے کو ''جدید ادب'' کے ہر تازہ شمارے میں جگہ ملنی چاہئے۔۔۔ آپ کے ''سدھارتھ'' پر تحریر کردہ تجزیاتی مطالعے نے بعض ایسے گوشوں کو اجاگر کیا ہے جو کم از کم میرے لیے بالکل نئے ہیں۔ اس قدر عمدہ تجزیاتی مطالعہ پیش کرنے پر میری جانب سے مبارکباد قبول فرمائیے۔

سلیم آغا قِزلباش (وزیر کوٹ۔ سرگودھا)

چنانچہ خطوط کے صفحات کی سولہ صفحات کی فائل تیسری بار اس ترمیم کے ساتھ شائع کی گئی کہ علی جاوید کا خط حذف کر کے، اس کی جگہ سلیم آغا قزلباش کا خط شامل کیا گیا۔ قطع نظر اس سے کہ نارنگ صاحب دہلی میں بیٹھے ہوئے علی جاوید کو تو روکنے کی ہمت نہیں رکھتے لیکن جدید ادب میں چھپا ہوا ان کا خط حذف کرانے کے لیے پاشا صاحب پر ہر طرح کا دباؤ ڈالتے ہیں۔ میری طرف سے اتنی لچک دکھائے جانے کے باوجود ڈاکٹر گوپی چند کی تشفی نہیں ہوئی۔ چنانچہ اس کے باوجود رسالہ کو ریلیز نہیں کیا گیا۔ میں نے مجبوری کی صورت میں جتنی لچک دکھانا تھی، دکھا دی۔ اس کے بعد میرے پاس ایک ہی راستہ تھا کہ پاشا صاحب کی مجبوریوں کا خیال کرتے ہوئے کسی اور پبلشر سے رابطہ کروں۔ لیکن کچھ پاشا صاحب کی ہمت سے اور کچھ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ صاحب کی مہربانی سے پھر رسالہ ریلیز کرنے کی اجازت دے دی گئی اور اب جدید ادب کا شمارہ نمبر ۱۲ جنوری

۲۰۰۹ء سے پہلے نومبر کی آخری تاریخوں ہی میں پاکستان اور جرمنی میں پہنچ چکا ہے۔

مجھے نارنگ صاحب کی ذہنی حالت پر بھی کچھ شک ہونے لگا ہے۔ وہ شمارہ ۹، ۱۰ اور ۱۱ کے تفصیلی مضامین کو تو جیسے تیسے برداشت کر گئے لیکن چند ہلکے پھلکے سے تنقیدی ردِ عمل پر اتنے گھبرا گئے کہ بار بار سنسر کرتے چلے گئے۔ یہ خطوط کچھ ایسے خطرناک نہ تھے۔ ریکارڈ کے طور پر وہ سارے خطوط یہاں درج کر رہا ہوں جنہیں سنسر کرنے کا اعزاز بخشا گیا۔ بعض خطوط میں سے صرف نارنگ صاحب کا نام حذف کر دیا گیا اور باقی جملہ ویسے رہنے دیا گیا تو وہ اسی پر خوش ہو گئے۔ سو جن خطوط میں سے صرف نارنگ صاحب کا نام حذف کیا گیا اور باقی جملے چھاپ دیئے گئے، انہیں بھی شامل کر رہا ہوں البتہ ان کے سنسر شدہ حصوں کو گہرا کر کے نمایاں کر دیا ہے

جدید ادب کے شمارہ نمبر ۱۲ کے سنسر شدہ خطوط

The article of Imran Shahid Bhender in Jadeedadab.com is indeed an eye opener. We are very well familiar with many other qualities of Narang sahib but this aspect is particulary interesting.Anyway, this is very unfortunate and plagiarism should be discouraged and condemned at every level. To achieve this goal I think wider publicity should be given to such cases.I am writing this letter to request you to allow us to reproduce the article in a new quarterly journal launched from Delhi. The journal 'Behs-o-Mubahisa' is started by a group of teachers and writers from Delhi. Asif Azmi is its editor and publisher. If you allow us, we would also like to have the matter as inpage file. I hope you would do this favour. However, if the permission is required from Imran shahid sahib, I would request you to send his email ID.

علی جاوید (دہلی)

گوپی چند نارنگ سے متعلق عمران شاہد کی مفصل اور مدلل تحریر ہر لحاظ سے لائق مطالعہ ہے۔ بلا شبہ مصنف کا لہجہ کہیں کہیں پر کچھ زیادہ ہی درشت ہو گیا ہے، تاہم تحریر کی افادیت (بلکہ حقانیت) سے انکار نہیں کیا جا سکتا اور اس کی بازگشت اردو دنیا میں دیر اور دور تک سنی جا سکے گی۔ حیرت ہے کہ **گوپی چند نارنگ** جیسا جہاں دیدہ اور زیرک نقاد اس دھوکے میں کیسے آ گیا کہ سرقے کا یہ معاملہ ہمیشہ صیغۂ راز میں ہی رہے گا! ایسا لگتا ہے کہ **نارنگ** صاحب نے اردو والوں کو کچھ زیادہ ہی Underestimate کر لیا اور دھوکا کھا گئے۔ ایک طرف عمران شاہد بھنڈر کی صریح، واضح اور مدلل تحریر ہے (جس کا تحقیقی اعتراف محترمہ شبانہ یوسف (برمنگھم) نے اپنے مراسلے میں کیا ہے) تو دوسری جانب **ڈاکٹر نارنگ کی** 'شان استغنا' سے پُر خاموشی،......اب ایسے میں سرقے کی بات کو کیونکر نظر انداز کیا جا سکتا ہے! اس سلسلے میں کاوش عباسی کے مراسلے کے ساتھ آپ نے جو ادارتی نوٹ لگایا ہے اس کی برجستگی مجھے بہت پسند آئی۔ دراصل آپ نے ہم اردو والوں کی دکھتی رگ پر انگلی رکھ دی ہے۔ ابھی کچھ دنوں پہلے کی بات ہے گیان چند جین کی کتاب 'ایک بھاشا، دو لکھاوٹ، دو ادب' پر اردو عوام الناس نے صدائے احتجاج بلند کیا تو چند ایک کو چھوڑ کر ہمارے بیشتر ادیبوں نے اس معاملے میں (تجاہل عارفانہ سے کام لیتے ہوئے) ایسی ''پراسرار خاموشی'' اختیار کر لی کہ اس کی گونج آج تک سنی جا سکتی ہے۔ اور اسکے بنیادی اسباب وہی تھے جن کا ذکر آپ نے اپنے ادارتی نوٹ میں کیا ہے۔ **ارشد کمال** (دہلی)

ایک بار پھر عمران شاہد بھنڈر کا مضمون **گوپی چند نارنگ** کے سرقہ کے بارے میں پڑھنے کو ملا۔ انہوں نے اس مضمون میں اس کے سرقے کے بارے میں مزید شواہد پیش کئے۔ حالانکہ بات تو پہلے ہی مضمون کے ساتھ واضح ہو گئی تھی۔ اور شاید عمران صاحب کو اس بات کا علم ہو گا کہ پاکستان اور بھارت میں یہ کوئی نئی بات بھی نہیں۔ یہاں تو شروع سے یہ کام چلا آ رہا ہے۔ آپ انیس جیلانی اور اس کے باپ کی مبارک اردو لائبریری کو تو جانتے ہیں۔ انیس جیلانی نے اپنے باپ کے نام نوازش نامے کے ساتھ جو خط چھاپے ہیں۔ اس میں نوح ناروی صاحب بھی اپنا ایک

دیوان فروخت کرنے لئے پیشکش لئے بیٹھے ہیں۔ اس طرح کی ادبی جعل سازی کے خلاف تو آپ نے ایک لمبی قلمی جدوجہد بھی کی ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ پنجاب یونیورسٹی لاہور اور زکریا یونیورسٹی ملتان کے کئی پروفیسروں (لیکچرار نہیں) کے پی۔ایچ ڈی کے تھیسیز چوری کے نکلے ہیں۔ جوانہوں نے باہر کے ملکوں میں جا کر سرکاری خرچوں پر چوری کئے تھے۔ ایسے پروفیسروں میں کئی برطرف ہو گئے ہیں اور کئی کے خلاف کارروائیاں چل رہی ہیں۔ میں یہ بھی ذاتی طور پر جانتا ہوں کہ بہت سے پرفیسروں کی کتابیں جن پر ان کے نام چھپے ہیں ان کے ایم۔اے۔ایم۔فل اور پی ایچ ڈی سٹوڈنٹس کی تحقیقات کا نتیجہ ہیں۔ بات کچھ لمبی ہو گئی ہے **دراصل میں بھنڈر صاحب سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ وہ اب نارنگ صاحب کی کسی اور کتاب کا جائزہ لیں مثال کے طور پر اردو زبان اور لسانیات وغیرہ کا اور اس میں دیکھیں کہ نارنگ صاحب نے کن کن پر ہاتھ صاف کیا ہے۔ آخری باب خاص طور پر قابل ملاحظہ ہے۔** **اسلم رسولپوری**۔ جام پور

رسالہ مل گیا۔ ابھی اچھی طرح نہیں پڑھا ہے۔ عمران شاہد کا مضمون بہت معلومات افزا ہے۔ ہائی ڈیگا۔ اور ڈریدا اس عہد کے بہت بڑے بورژوازی اور استعماری مقاصد کے آلۂ کار ہیں اس سے بڑا یہ سچ ہے کہ ہمارے عہد کے ''بڑے نقاد'' عموماً خود ساختہ بڑے ہیں۔ اور مغربی افکار کے، زہریلے مقاصد کو، اس میں پوشیدہ ایجنڈے کو صحیح طور پہ سمجھے بغیر پنڈت بن کر پڑھانے لگتے ہیں، اور اذیت کی بات یہ ہے کہ اگر آپ عام آدمی کی نہیں خواص کے بھی ذہنی افق کو وسعت دینا چاہیں اور انھیں باخبر کرنا چاہیں تو اس قسم کا سوال کیا جاتا ہے کہ۔ مغربی تنقیدی کلیات سے ہمارا کیا کام؟ اگر اکثریت ایسے لوگوں کی ہو جو جہالت اوڑھے رکھنے پہ بضد ہوں تو نارنگ صاحب جیسے پنڈت خدائے تنقید نہ بنیں تو کیا کریں۔ میرے اپنے ایک مضمون ''قاری کی ردِعمل تنقید کیا ہے'' (مطبوعہ سہ ماہی تجدید نو۔ لاہور شمارہ اکتوبر تا دسمبر ۲۰۰۶ء) کا تعلق اس بات سے تھا کہ مغرب میں ادب سیاسی مقاصد کیلئے کیسے استعمال ہوتا ہے۔ اور قاری کے ردِعمل کی تنقید اسی سلسلے کی کڑی کیسے ہے؟

اسی رویے کے خلاف ایڈورڈ سعید نے اشارہ کیا ہے کہ دانشوروں کو مکتبی، اور ادارتی منتظمین کا غلام نہیں ہونا چاہیئے۔ مابعد جدیدیت ایک مجہول نقطۂ نظر تھا مگر ہمارے ہاں نقادوں نے بزعمِ خود خوب میدان مارے، بغیر جانے کہ اس تحریک کا مقصد نئی استعماریت کا فروغ تھا۔ عمران شاہد کے نارنگ صاحب پہ اعتراضات سے مجھے پورا اتفاق ہے اسلئے بھی کہ میں نے گزشتہ سال ڈریدا اور فیمنزم کے گٹھ جوڑ پہ ایک مضمون لکھا تھا اس سلسلے میں تنقیدی نظریات کی پوری تاریخ پڑھی تھی۔ اور وہ دماغ میں تازہ ہے، ایک دلچسپ بات اور بھی ہے کہ مجھے ایک قریبی جاننے والے نے بتایا کہ نارنگ صاحب سربیٹن کی لائبریری میں بیٹھ کر اردو تنقید پہ کوئی کتاب لکھا کرتے تھے۔ مجھے بہت حیرت یوں ہوئی کہ اردو کی ایک کتاب بھی ہمارے علاقے کی لائبریری میں نہیں تھی میں نے مقامی ایم پی سے مل کر جنگ اخبار لگوایا تھا اور تب سے یہاں چند اردو کی کتابیں رکھی جانے لگیں ہیں۔ تو یقیناً وہ اُن دنوں اردو کی نہیں انگریزی کی کتاب ترجمہ کر رہے تھے اور یہاں اردو کتابیں آنے سے بہت پہلے نارنگ صاحب اپنی علمیت کے شہرۂ آفاق پہ پہنچ چکے تھے۔

انگریزی کی کوئی کتاب بھی کچھ پیسے دیکر منگوائی جاسکتی ہے جو انڈیا میں نہیں ملے گی۔ اگر چہ کاپی رائٹ کا قانون یہاں موجود ہے تاہم انڈیا پاکستان میں آپ پوری کتاب اپنے نام سے چھپوالیں کوئی کچھ نہیں کرسکتا۔ پاکستان میں لوگوں نے نارنگ صاحب سے اس سرقے کے بارہ میں پوچھا تھا مگر انھوں کوئی جواب نہیں دیا۔ جس سے عمران صاحب کے الزامات کو تقویت ملتی ہے۔ ویسے نارنگ صاھب کو یقین ہے کہ انڈیا میں کوئی انکا کچھ بگاڑ نہیں سکتا۔ انکی علمیت کا بت تو پاکستان میں بہت اونچے مقام پہ ہے۔ جب لوگوں کو براہِ راست پڑھنے کے بجائے دوسروں کا ملغوبہ مل جائے اور شاعری میں تک بندی معراجِ ادب قرار دیجائے تو سب کچھ ممکن ہے۔ لوگ آئے دن ڈاکٹریٹ کرتے ہیں اور دوسروں کے خیالات کو دوبارہ پیش کر دیتے ہیں۔ کسی کو پتہ نہیں چلتا۔

حمیدہ معین رضوی (لندن)

جدید ادب شمارہ نو (۹) شمارہ دس (۱۰) اور شمارہ گیارہ (۱۱) میں جناب گوپی چند نارنگ پر جناب

عمران شاہد بھنڈر کے مضامین کا ہنگامہ۔ آپ کے ادارتی نوٹ اور جوئیہ صاحب کا ردعمل یہ سب خصوصی توجہ کے مستحق ہیں۔ جناب عمران شاہد بھنڈر نے اپنے انکشافات کو بڑے مدلل طریقہ سے اقتباسات اور حوالوں کے ساتھ پیش کرتے ہوئے مغربی مفکرین کی نقالی اور سرقے کو ہی نارنگ کی ادبی شناخت ثابت کر دیا ہے۔ اس سلسلہ میں محترمہ شبانہ یوسف نے ان تمام کتب تک رسائی حاصل کی جنکا حوالہ بھنڈر صاحب نے اپنے مضمون میں دیا محترمہ کا تفصیلی خط شمارہ نمبر گیارہ بے حد اہم گواہی پیش کرتا ہے۔ جس کے بعد شک وشبے کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ اب اس بحث نے نیا دروازہ کھول دیا ہے۔ فی الوقت نارنگ صاحب کی مجرمانہ خاموشی پر ہنسی آ رہی ہے۔ ردعمل کے طور پر جاوید حیدر جوئیہ صاحب کا مضمون نفس مضمون سے ہٹ کر ذاتیات کو نشانہ بناتے ہوئے مخالفت برائے مخالفت کا ایک نمونہ پیش کرتا ہے۔ آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا......

تنہا تما پوری (تماپور)

ہندوستان کے بارے میں ابھی تک میرا تاثر اور تجربہ یہی تھا کہ وہاں آزادیٔ اظہار زیادہ ہے۔ میں نے اپنے صحافتی کالموں میں ہندوستان کے انتہا پسند ہندوؤں اور ان کے رہنماؤں کے بارے میں خاصے سخت الفاظ لکھے ہیں لیکن میرا وہ لکھا ہوا انڈیا ہی میں چھپتا رہا ہے۔ کالم کی صورت میں بھی اور کتابی صورت میں بھی۔ لیکن کسی نے بھی اس آزادیٔ اظہار میں رخنہ پیدا نہیں کیا۔ اسی وجہ سے میرے دل میں انڈیا کی حکومتوں اور اداروں کے لیے احترام کا جذبہ رہا ہے۔ مجھے احساس ہے کہ انڈیا میں صحافتی آزادی کا مجموعی تاثر وہی ہے جو میرے دل میں موجود ہے لیکن ڈاکٹر گوپی چند نارنگ صاحب نے مغربی ادب سے اپنے کھلے سرقوں کے کھلے ثبوتوں کا جواب دینے کی بجائے جو طرزِ عمل اختیار کیا ہے وہ ہندوستان کی علمی، ادبی اور صحافتی ساکھ پر ایک بدنما داغ ہے۔

میں حکومت ہند سے درخواست کرتا ہوں کہ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ صاحب کی جانب سے کی جانے والی اس بلیک میلنگ کا نوٹس لے، جس نے انڈیا میں مہذب طریقے سے کیے جانے والے آزادیٔ اظہار کا گلا گھونٹنے والی حرکت کی ہے۔ اسی طرح ان کی کتاب **ساختیات، پس**

ساختیات اور مشرقی شعریات کے سلسلہ میں ایک علمی کمیٹی بٹھائی جائے جو تحقیق کرے کہ نارنگ صاحب نے واقعی یہ سارے شرمناک سرقے کیے ہیں یا ان پر بے جا الزام ہیں۔اگر وہ پاک صاف ثابت ہوں تو ان کی مذکورہ کتاب کا انگریزی ترجمہ سرکاری طور پر شائع کرایا جائے۔اور میں **جدید ادب** میں اس کتاب کے سرقوں کے حوالے سے چھپنے والے سارے میٹر کے لیے انڈیا کے قانون کے مطابق بخوشی ہر سزا بھگتنے کے لیے تیار رہوں گا۔

مغربی دنیا میں اردو کے جتنے رسائل چھپتے ہیں،سب کے سب پاکستان اور ہندوستان سے چھپ کر وہاں سے ریلیز کیے جاتے ہیں۔ان میں زیادہ تر کتابی سلسلے ہی ہیں۔میرے پاس ایسے تمام رسائل کی پوری لسٹ موجود ہے جو انڈیا سے چھپ کر یورپ سے ریلیز کیے جاتے ہیں۔اور تو اور ایک پاکستانی رسالہ بھی انڈیا سے چھپ کر دنیا بھر میں ریلیز کرنے کی خبر آچکی ہے۔ادبی رسائل میں چھپنے والے مواد کا تعلق علم و ادب سے ہوتا ہے۔نارنگ صاحب کے بارے میں بھی جو کچھ شائع کیا گیا وہ سراسر علمی و ادبی معاملہ ہے۔اردو دنیا جس نقاد پر ناز کرتی رہی اس کا جو اصلی علمی حدود اربعہ سامنے آچکا ہے وہ خود اردو والوں کے لیے انتہائی افسوسناک ہے۔اپنے سرقوں کا سامنا کرنے کی بجائے آئینہ دکھانے والوں کے آئینہ کو توڑنے کو کاوش کرنا ہرگز مستحسن نہیں ہے۔

آپ کتنے آئینے توڑیں گے؟

اپنے آپ کو دیکھئے اور پہچانئے نارنگ صاحب!

(تحریر کردہ :۴؍دسمبر ۲۰۰۸ء۔جرمنی سے)

(مطبوعہ سہ ماہی **اثبات** تھانے،ممبئی۔شمارہ نمبر ۳۔

دسمبر ۲۰۰۸ء تا جنوری،فروری ۲۰۰۹ء)

(روزنامہ **ہندوستان ایکسپریس** دہلی

عکاس انٹرنیشنل اسلام آباد ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نمبر مئی ۲۰۰۹ء)

اس مضمون کی بروقت اشاعت کے لیے اشعر نجمی مدیر اثبات کا خصوصی شکریہ! ح۔ق

عکاس انٹرنیشنل اسلام آباد کا گوپی چند نارنگ نمبر

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کی شاہکار تصنیف ''ساختیات، پس ساختیات اور مشرقی شعریات'' کے بارے میں عمران شاہد بھنڈر کا ایک مضمون ایک اخبار اور ایک رسالہ میں چھپا تھا،لیکن دو سال کے عرصہ میں اہلِ ادب نے اس کا نوٹس نہیں لیا۔مجھے اس مضمون کا علم ہوا تو میں نے مضمون نگار سے رابطہ کر کے اس مضمون کو جدید ادب میں چھاپنے کی خواہش ظاہر کی۔اس سے عمران شاہد بھنڈر کو تحریک ملی اور انہوں نے مضمون میں مزید اضافے کر کے مجھے بھیج دیا۔جدید ادب شمارہ نمبر ۹ میں یہ مضمون چھپتے ہی ادبی دنیا میں تہلکہ سا مچ گیا۔اس مضمون میں عمران شاہد بھنڈر نے یہ بتایا تھا کہ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کی یہ کتاب ان کی تصنیف نہیں بلکہ مغربی کتابوں سے بلاحوالہ ترجمہ ہے۔جدید ادب کے شمارہ نمبر ۱۰ میں اس کے جواب میں جاوید حیدر جوئیہ نے نارنگ صاحب کا دفاع کرنے کی کوشش کی لیکن ایسا دفاع جس کے بعد نارنگ صاحب پر بلاحوالہ ترجمہ کے الزام کی بجائے براہ راست سرقہ کے الفاظ استعمال کیے جانے لگے۔عمران شاہد نے اس مضمون کا بھرپور جواب لکھا۔پھر شمارہ نمبر ۱۱ میں عمران نے مزید حوالوں کے ساتھ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے سرقوں کو بے نقاب کیا۔عمران شاہد کے تینوں مضامین چونکہ جدید ادب میں چھپنے کے باعث انڈو پاک میں بڑی سطح پر پڑھے گئے اور ان کا چرچا اتنا عام ہوا کہ کئی اخبارات و رسائل نے ان کی مکرر اشاعت کی۔سرقہ کی نشاندہی کرنے والے ان مضامین کی اشاعت کے ساتھ جدید ادب میں نارنگ صاحب سے درخواست کی گئی کہ وہ خود ان کا جواب لکھیں لیکن نارنگ صاحب نے سرقہ کے الزام سے بریت کے لیے کوئی مدلل جواب دینے کی بجائے جدید ادب کی دہلی سے اشاعت میں رخنہ پیدا کر دیا۔اس کی نہایت افسوسناک اور تفصیلی روداد میرے مضمون ''جدید ادب کے شمارہ نمبر ۱۲ کی کہانی۔۔ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کی مہربانی در مہربانی'' کے عنوان سے ''اثبات''

ممبئی کے شمارہ نمبر۳ میں چھپ چکی ہے۔شمیم طارق نے''اثبات'' میں نارنگ کے سرقوں کا دفاع کرنے کی غیر علمی کاوش کی تو اشعر نجمی نے اثبات ہی میں اس کا مدلل جواب دے دیا۔

یہ مختصر روداد اس پس منظر کو واضح کرنے کے لیے بیان کی ہے، جس کے نتیجہ میں اب ارشد خالد اور ناصر نظامی کی ادارت میں عکاس انٹرنیشنل اسلام آباد کا شمارہ نمبر ۹ بطور گوپی چند نارنگ نمبر شائع ہوا ہے۔اس نمبر میں مذکورہ بالا سارے مضامین کو پورے حوالہ جات کے ساتھ یکجا کر دیا گیا ہے۔ان کے علاوہ عمران شاہد بھنڈر کا نیا مضمون''سرقے کا کوہ ہمالیہ'' بھی شامل کیا گیا ہے۔ان مضامین میں سرقوں کے اتنے اقتباسات دیئے گئے ہیں کہ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کی علمی حیثیت کو داغدار کرنے کے لیے وہی کافی ہیں۔لیکن صرف اس پر اکتفا نہیں کیا گیا۔مزید تین بڑے چیلنج بھی دیئے گئے ہیں۔۱۔نارنگ کی کتاب کے صفحہ نمبر ۳۳ سے لے کر ۳۴۳ تک صرف بیس صفحات بھی ایسے نہیں ہیں جو انگریزی کتابوں کا لفظ بلفظ ترجمہ نہ ہوں۔۲۔رامن سیلڈن کی کتاب Contemporary Literary Theory سے جو سرقہ کیا گیا ہے وہ ساٹھ صفحات سے بھی زیادہ ہو گیا ہے۔۳۔ٹیرنس ہاکس کی کتاب Structuralism and Semiotics پیراگرافس کے معمولی ادل بدل کے ساتھ پوری کی پوری اپنی کتاب میں شامل کر لی ہے۔دو سال سے زائد عرصہ ہو چلا ہے لیکن نارنگ صاحب ابھی تک اپنے سرقوں کے بارے میں کھل کر کچھ بھی نہیں کہہ سکے۔بس اتنا کیا کہ میرے پبلشر کو دھمکا کر جدید ادب میں نارنگ کے خلاف کسی خط میں بھی کچھ چھاپنے سے روک دیا۔ارشد خالد نے عکاس میں یہ سارے شواہد مکمل حوالوں کے ساتھ یکجا کر دیئے ہیں، جس سے نارنگ صاحب کے سرقوں کی حقیقت پوری طرح آشکار ہو گئی ہے۔

گوپی چند نارنگ نمبر کا پہلا حصہ نارنگ صاحب کے فن اور شخصیت سے متعلق ہے۔اس میں جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے سابق وائس چانسلر پروفیسر مسعود حسین خاں، مشفق خواجہ، وسیم مینائی، کمارل انل، فاروق ارگلی، سکندر احمد، ارون کمار، زبیر رضوی، تنہا تماپوری اور محمد احمد سبزواری کے تاثرات وانکشافات شامل ہیں۔پروفیسر مسعود حسین خاں کی تحریر میں آدھ گھنٹہ دورانیہ کی ایک ایسی ٹیپ کا ذکر ہے جو نارنگ صاحب کی ایک طالب علم رہتاس کے ساتھ گفتگو پر مشتمل تھی اور جس

میں مسلمانوں کے خلاف انتہائی زہریلی زبان استعمال کی گئی تھی۔یہ ٹیپ بعد میں جامعہ ملیہ دہلی میں لاؤڈ اسپیکرز کے ذریعہ نشر کی جاتی رہی۔مشفق خواجہ نے انہیں ساختیات ہی کا نہیں خود ساختیات کا بھی ماہر قرار دیا ہے۔انڈیا کے جاننے والوں نے انکشاف کیا ہے کہ نارنگ صاحب نے اپنی دوسری شادی کے لیے بمبئی فلم انڈسٹری والوں کے معروف طریق کار کے مطابق اسلام قبول کیا، جمیل تابش نام اختیار کیا اور اسلامی طریق کے مطابق دوسری شادی کی سہولت حاصل کر لی۔بعض احباب نے اعداد و شمار کی زبان میں سوال اٹھائے ہیں کہ اردو کے فروغ کے سرکاری اداروں میں نارنگ صاحب کے اقتدار کے دنوں میں اردو زبان کا کیا بھلا ہوا؟

فضیل جعفری کے مضمون''امریکی شوگر ڈیڈی اور مابعد جدیدیت'' کا ایک اہم حصہ بھی اس نمبر میں شامل کیا گیا ہے۔اس کے علاوہ نصرت ظہیر، ارشد خالد، غفور شاہ قاسم، ڈاکٹر رشید امجد، احمد ہمیش اور منو بھائی کے بعض برجستہ، دلچسپ اور فکر انگیز اقتباسات بھی اس نمبر کی زینت بنے ہوئے ہیں۔اس خاص نمبر کا اداریہ پاکستان کے ڈاکٹر نذر خلیق سے لکھوایا گیا ہے اور انہیں بطور مہمان مدیر شامل کیا گیا ہے۔خیال رہے کہ ڈاکٹر نذر خلیق نے''اردو ادب میں سرقہ اور جعلسازی کی روایت'' کے موضوع پر پی ایچ ڈی کی ہے۔ان کا اداریہ نارنگ کے سرقہ کے پورے منظر کا احاطہ کرتا ہے۔مجموعی طور پر عکاس کے گوپی چند نارنگ نمبر میں ان کے سرقوں سے متعلق سارا میٹر یکجا کر دینے کی وجہ سے اس نمبر کو دستاویزی حیثیت حاصل ہو گئی ہے۔نانگ صاحب پر غیر جانبدارانہ کام کرنے والے اس نمبر سے استفادہ کرتے رہیں گے۔مجھے خوشی ہے کہ اس نیک علمی و ادبی کام میں میرا بھی تھوڑا بہت حصہ شامل ہے۔

(مطبوعہ ڈیلی **جنگ** لندن ۲رجولائی ۲۰۰۹ء)

عکاس کے ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نمبر کو آن لائن پڑھنے کے لیے اس لنک سے ڈاؤنلوڈ کیا جا سکتا ہے۔

http://www.urdudost.com/library/index_mutafarriqat.php

انٹرنیٹ پر ایک اوپن مکالمہ

نصرت ظہیر۔۔حیدر قریشی

نوٹ:

نصرت ظہیر صاحب کی طرف سے اصل بات صرف اتنی تھی کہ ان کے خیال میں عکاس انٹرنیشنل کے گوپی چند نارنگ نمبر میں ان کا جو اقتباس دیا گیا ہے وہ سیاق وسباق سے کاٹ کر دیا گیا ہے اور اس طرح جعلسازی کی گئی ہے۔لیکن اس کے ساتھ ہی انہوں نے بات اپنی صفائی تک محدود نہ رکھی اور متعدد غیر متعلق باتیں اٹھاتے چلے گئے۔میں نے بعض غیر متعلق باتوں کے سلسلہ میں تھوڑی بہت وضاحت کر دی،تاہم پوری توجہ نصرت ظہیر صاحب کے ''سیاق وسباق'' سے کاٹ کر جعلسازی کرنے کے الزام اور ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے سرقوں پر مرکوز رکھی۔بہت سی غیر متعلق باتوں اور طنزیہ جملوں کا میں نے جواب دینے سے گریز کیا کہ اس سے بحث اصل مسئلہ کے موضوع کے مدار سے باہر نکل جاتی۔یہ ساری خط و کتابت جو نصرت ظہیر صاحب نے خود اوپن مکالمہ کی صورت میں شروع کی تھی،ریکارڈ کے طور پر محفوظ کر رہا ہوں۔(ح۔ق)

نصرت ظہیر صاحب کی پہلی ای میل ۲۹ر جون ۲۰۰۹ء کو جرمن ٹائم کے مطابق نو بج کر پچیس منٹ پر ریلیز ہوئی اور ۲۹ر جون ہی کو ٹھیک دو گھنٹے کے بعد گیارہ بج کر پچیس منٹ پر میرا جواب ریلیز کر دیا گیا۔دونوں میلز کا متن پیشِ خدمت ہے۔

نصرت ظہیر بنام حیدر قریشی۔۱

محترم حیدر قریشی صاحب! آداب

میری مصروفیتیں حسبِ معمول بڑھی ہوئی ہیں اس لئے آپ کا بھیجا ہوا'' نارنگ مخالف عکّاس نمبر'' ابھی تک پورا نہیں پڑھ سکا ہوں اور نہ ہی اب میرا اسے مزید پڑھنے کا ارادہ ہے کیونکہ اتنا فضول وقت میرے پاس نہیں ہے۔یہ تو میں جانتا تھا کہ آپ نارنگ صاحب کے بعض وجوہ کی بنا پر(جن کا پورا علم شاید آپ ہی کو ہوگا) شدید مخالف ہیں،لیکن آپ اس قسم کی بددیانتی بھی کر سکتے ہیں، یہ میرے لئے نیا اور خاصا تکلیف دہ تجربہ اس لئے ہے کہ اب تک میں آپ کا اور آپ کی معروضیت کا خاصا معترف رہا ہوں اور اس کا اپنی بعض تحریروں میں اعتراف بھی کر چکا ہوں۔لیکن اب مجھے لگتا ہے اپنے خیالات میں کچھ ترمیم کرنی پڑے گی۔

نارنگ صاحب کی اندھی مخالفت میں آپ نے میرے ایک مزاحیہ مضمون کے اقتباسات کو اس انداز سے ساتھ رکھ کر اس' نمبر' میں شائع کیا گویا یہ تحریریں گوپی چند نارنگ صاحب کے خلاف ہیں۔حالانکہ وہ ادب کی عمومی صورتِ حال پر سادہ سا طنز تھا۔اس میں آپ کو مابعدِ جدیدیت کے پیچھے نارنگ صاحب تو نظر آ گئے، جدیدیت کے ڈھونگ کے پیچھے شمس الرحمٰن فاروقی صاحب کی ذاتِ بے برکات نظر نہیں آئی۔آپ کے معروضی اندازِ فکر پر کچھ شبہ مجھے اس وقت ہوا تھا جب آپ شب خون کے خبر نامے میں چھپنے والے اپنے خط سے' کئی چاند تھے سرِ آسماں' پر کئے گئے اعتراض سے متعلق پیراگراف حذف کرنے کی فاروقی صاحب کی حرکت پر خاموشی اختیار کر گئے تھے۔ آپ جیسا ٹچی touchy شخص اس پر کیوں چپ رہ گیا یہ میرے لئے حیرت کا مقام ہے۔

آپ کو اور عمران بھنڈر صاحب کو نارنگ صاحب کی کتاب میں سہواً بعض اقتباسات کے حوالے نہ دئے جانے پر سرقہ کا شبہ نہیں بلکہ یقین ہو گیا،لیکن میرے مضمون کو غلط سیاق وسباق میں شرارتاً اس طرح پیش کرنے میں غالباً آپ کو کچھ بھی غلط محسوس نہیں ہوا ہوگا حالانکہ یہ کھلی جعل سازی ہے جو سرقے سے بھی درجہ میں' برتر و افضل' ہوتی ہے۔

آپ کواس بات میں تو یکّی فرقہ پرستی نظر آ گئی کہ ایک مضمون نگار نے 'ادب ساز' میں چھپنے والے ایک مضمون میں آپ کے پاکستان میں معتوب مذہبی مسلک کا ذکر کرکے آپ کے خلاف مذہبی منافرت پھیلانے کی کوشش کی تھی لیکن خود آپ کی ادارت ومعاونت سے چھپنے والے اس 'نمبر' میں نارنگ صاحب پر جگہ جگہ فرقہ پرستی اور زعفرانیت کے کھلے الزام کسی ثبوت کے بغیر لگائے گئے ہیں اس میں نہ آپ کو کسی طرح کی ناانصافی دکھائی دی نہ شرم آئی۔ یہاں تک کہ نارنگ صاحب کی دوسری شادی کے تعلق سے ان پر beltthebelow حملہ کرنا بھی غالبًا آپ کے لئے ایک شریفانہ اور مہذب حرکت ہے۔'ادب ساز' والے مضمون نگار کی حرکت آپ کو متعصّبانہ لگی (اور درحقیقت وہ تھی بھی) لیکن 'عکاس' کی زہریلی تحریریں آپ کو قند، بلکہ قلاقند لگ رہی ہیں۔ میں نے پہلے بھی آپ سے کہا تھا کہ نارنگ صاحب کی کسی تحریر یا تقریر میں آپ مجھے مذہبی تعصب یا اردو دشمنی کے دو جملے بھی دکھا دیجئے، میں آپ کا غلام ہو جاوں گا۔

یہ آپ نے یا شاید عکاس کے مدیر نے درست لکھا ہے کہ عمران بھنڈر صاحب کو اب تا زندگی اس بات کے لئے یاد کیا جائے گا کہ انہوں نے نارنگ صاحب کو سارق قرار دیتے ہوئے ایک مضمون لکھا تھا۔ میں اس میں صرف یہ اضافہ کروں گا کہ عمران صاحب صرف اسی ایک' کام' کے لئے جانے بھی جائیں گے۔مستقبل میں انہیں کوئی ڈھنگ کا کام کرنے کی سعادت شاید ہی حاصل ہو۔

آپ نے میرے مضمون کے ساتھ دنیا بھر میں یہ' عکاس' بھیجا ہے اس لئے ان سبھی کو میں اپنا جواب بھی ای میل سے بھیج رہا ہوں۔

امید ہے بخیر ہوں گے۔

نصرت ظہیر

حیدر قریشی بنام نصرت ظہیر۔۱

برادرم نصرت ظہیر صاحب سلام مسنون

آپ کی ای میل پڑھ لی۔شکریہ۔ مجھے اس کے جواب میں چند وضاحتیں کرنا ضروری لگ رہا ہے۔

پہلے تو آپ کا شکریہ کہ آپ نے یہ اعتراف کیا کہ آپ نے میرے خلاف جو غلیظ مضمون شائع کیا تھا اس میں فرقہ پرستانہ تعصب تھا۔پہلی ای میلز کے ذریعے بھی اور ٹیلی فون کی گفتگو میں بھی آپ نے خود بتایا تھا کہ میرا گوشہ چھاپنے پر نارنگ صاحب نے آپ سے ایک سے زائد بار پوچھا تھا کہ اس شخص کی کیا ادبی حیثیت تھی جو اس کا گوشہ شائع کیا؟ آپ نے جو جواب دیا وہ میں نہیں دہراؤں گا،آپ بخوبی جانتے ہیں کہ میری تخلیقات کے حوالے سے آپ کا کیا تاثر ہے۔نارنگ صاحب نے آپ سے کس لیے جواب طلبی کی تھی اور انہیں یہ استحقاق کس بنیاد پر ادب ساز کے مدیر نے دیا تھا وہ آپ دونوں کا آپسی معاملہ ہے۔وہ غلیظ مضمون جو آپ کو فروری ۲۰۰۹ء میں موصول ہوا وہ دسمبر ۲۰۰۸ء تک کے ادب ساز میں اسے لیٹ چھاپ کر کیسے شامل کیا گیا۔ایک مضمون جس کے فرقہ پرستانہ ہونے کا آپ بھی اعتراف کرتے ہیں،تاخیر سے ملنے کے باوجود کس کے کہنے پر شامل کیا گیا؟

آخر اس مضمون میں کونسی ایسی بات تھی جس کی وجہ سے آپ کو رسالہ دو مہینے لیٹ کر کے بھی اسے شامل کرنا پڑا۔اس شخص کی اصلیت کے طور پر جب میں نے آپ کو پرواز لندن کے شمارہ اپریل ۲۰۰۲ء میں چھپنے والا مضمون **ادب کے کھیپیے** بھیجا تو آپ نے خود مانا کہ ہاں اس شخص نے فارسی سے چوریاں کی ہیں۔تو صاحب! نارنگ صاحب کے دفاع میں آپ نے ایسا مضمون شائع کیا جو غلیظ اور فرقہ پرستانہ بھی تھا اور ایسے شخص کا لکھا ہوا تھا جو خود فارسی سے چوریاں کر کے نقاد بنا بیٹھا تھا۔گویا نارنگ صاحب کی چوریوں کی صفائی وہ دے رہے ہیں جو خود چوریاں کر چکے ہیں اور جن کی چوریاں بھی آن ریکارڈ ہیں۔سب کہو سبحان اللہ!

میں یہاں کھل کر اعتراف کرتا ہوں کہ اس نمبر کی اشاعت میں میرا پورا تعاون شامل

تھا تاکہ آنے والے وقت میں اس کے گناہ یا ثواب میں مجھے پورا شامل رکھا جائے۔ اس وقت پبلک ریلیشنگ کے بل پر جتنی کاری گری دکھا دی جائے لیکن یہ حقیقت ہے کہ ڈاکٹر نارنگ کے سرقے علمی و ادبی طور پر آشکار ہو چکے ہیں۔ متعدد عام اقتباسات کو نظر انداز کرتے ہوئے عکاس کے نارنگ نمبر میں پیش کیے گئے تین اہم ترین سرقوں کے شواہد یہاں بھی دہرا دیتا ہوں۔

۱۔ نارنگ صاحب کی کتاب کے صفحہ نمبر ۳۳ سے کے کر ۳۳۴ تک صرف بیس صفحات بھی ایسے نہیں ہیں جو انگریزی کتابوں کا لفظ بلفظ ترجمہ نہ ہوں۔ ۲۔ رامن سیلڈن کی کتاب Contemporary Literary Theory سے جو سرقہ کیا گیا ہے وہ ساٹھ صفحات سے بھی زیادہ ہو گیا ہے۔ ۳۔ ٹیرنس ہاکس کی کتاب Structuralism and Semiotics پیراگرافس کے معمولی ادل بدل کے ساتھ پوری کی پوری اپنی کتاب میں شامل کر لی ہے۔ دو سال سے زائد عرصہ ہو چلا ہے لیکن نارنگ صاحب ابھی تک اپنے سرقوں کے بارے میں کھل کر کچھ بھی نہیں کہہ سکے

متعدد مغربی مفکرین کے اتنے فراخدلانہ سرقے کر لیے اور سمجھ لیا کہ اپنے حاشیہ برداروں کے تعاون سے دھونس جما کر الزام سے بریت حاصل کر لیں گے۔ نہیں صاحب! یہ سرقے اب نارنگ صاحب کی علمی و ادبی حیثیت کا فیصلہ کریں گے۔ ان سے مفادات وابستہ رکھنے والے لوگوں کے ذریعے سے نہیں بلکہ وقت ان کے خلاف فیصلہ صادر کرے گا اور اپنے ذاتی مفادات کی سطح سے بلند ہو کر سنئے تو وقت ان کے سرقوں کا فیصلہ سنا رہا ہے۔ اب کوئی بڑے سے بڑا ایوارڈ، کوئی بڑے سے بڑا اعزاز بھی ان کے سرقوں کی سیاہی کو نہیں دھو سکتا۔ یہ سب عارضی شعبدے ہیں، حقیقت اپنی جگہ پر موجود ہے۔

جہاں تک آپ کے اقتباس کو سیاق و سباق سے کاٹ کر شامل کرنے کی دہائی کا تعلق ہے، یہ سراسر جھوٹ اور دھوکہ ہے جو آپ دنیا کو دینا چاہ رہے ہیں۔ آپ کا اقتباس صاف ظاہر کرتا ہے کہ اس کا روئے سخن کس کی طرف ہے۔ آپ کا اقتباس میں پیش کر رہا ہوں۔

”اردو زبان و ادب کی جتنی خدمت ادبی معموں نے کی ہے اتنی ہمارے خیال سے کسی نے بھی نہیں کی ہوگی۔ یہاں معموں سے ہماری مراد وہ چلتی پھرتی محترم شخصیتیں ہرگز نہیں ہیں جن کے نام

کے ساتھ پروفیسر یا ڈاکٹر کا لاحقہ جڑا رہتا ہے اور جنھوں نے جدیدیت، مابعد جدیدیت اور ساختیات و پسِ ساختیات کے چکر میں ڈال کر خود اردو ادب کو ایک معمہ بنا ڈالا ہے۔۔۔۔ اُس زمانے میں ادبی معمے اردو والوں کو اور بھی کئی خرافات سے دور رکھتے تھے۔ نہ انہیں اس کی فکر رہتی تھی کہ کس اردو اکادمی نے اس مرتبہ کس غیر مستحق ادیب کو ایوارڈ سے نوازا ہے اور نہ وہ اس بحث میں پڑتے تھے کہ مابعد الجدیدیت اور ساختیات و پسِ ساختیات کی اوّلین دریافت کا سہرہ کس کے سر باندھا جائے۔ نیز یہ کہ جدیدیت کے بعد مابعد جدیدیت آئی ہے تو کیا اس اصول کے تحت مابعد جدیدیت کے بعد ماما بعد جدیدیت آئے گی؟ اور کیا سن ۲۱۵۵ء تک آتے آتے اردو ادب میں ماماماماما بعد جدیدیت پڑھی جا رہی ہوگی؟ “

(نصرت ظہیر کے طنزیہ اردو کے ادبی معمے سے اقتباس)

اس اقتباس کا روئے سخن کس طرف ہے قارئین خود اندازہ کر سکتے ہیں۔ البتہ اس کے جس سیاق و سباق کو کاٹ کر اسے لگانے کا آپ الزام لگا رہے ہیں، یہ سراسر غلط ہے۔ آپ خود اس اقتباس کے سیاق و سباق کو ملا کر اسی طرح ریلیز کر دیں دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے گا۔ آپ کے اقتباس کو ہرگز ہرگز کسی سیاق و سباق سے کاٹ کر پیش نہیں کیا گیا۔ یہ شاید آپ ڈاکٹر نارنگ کے عتاب سے بچنے کے لیے لکھ کر اپنی بریت کرانا چاہ رہے ہیں۔

جب شمس الرحمٰن فاروقی صاحب اردو کونسل میں گئے تھے تو انہوں نے وہ ہندی رسالہ بند کرا دیا تھا جو اردو کے نام پر چھپ رہا تھا۔ اس وجہ سے آپ کو بے روزگار ہونا پڑا۔ آپ کو معلوم ہے کہ مجھے آپ کی بے روزگاری کا کتنا دکھ ہوا تھا۔ اردو کے نام پر ہندی رسالہ نکالنا تو شاید مستحسن نہ تھا، تاہم میں سمجھتا ہوں کہ آپ سمیت تمام متاثرین کی ملازمتوں کو پورا تحفظ دیا جانا چاہیے تھا۔ میں اسے فاروقی صاحب کی زیادتی سمجھتا ہوں۔ اس سے زیادہ مجھے فاروقی صاحب کے معاملہ پر کچھ نہیں کہنا لیکن آپ نے جو چٹ دینے کی کوشش کی ہے تو اتنا واضح کرتا ہوں کہ میں نے ان کی انتہا پسند جدیدیت کے حوالے سے جو موقف اختیار کیا تھا اس پر اب بھی قائم ہوں۔ ہاں مجھے ان کے ناول پر لکھے ہوئے اپنے مضمون کے چند جملوں کے حذف ہونے کے بعد خود احساس

ہوا کہ ان کے ناول پر لکھتے ہوئے اس حصے کا حذف کر دیا جانا ہی بہتر ہے۔سو یہ اپنے لکھے پر مزید غور کر لینے کا میرا حق تھا۔ چنانچہ میں نے اس مضمون میں مزید اضافہ بھی کیا۔ناول پر لکھے ہوے میرے سبقِ اردو والے مضمون کے مقابلہ میں جدید ادب شمارہ ۱۱، جولائی ۲۰۰۸ء میں چھپنے والا مضمون پہلے سے زیادہ طویل اور نظر ثانی شدہ ہے۔ یہ ویسا ہی کچھ یا ملتا جلتا سا ہے جیسے آپ نے میرے بارے میں لکھنے کے بعد اور مجھے مضمون بھیجنے کے بعد پھر یہ چاہا تھا کہ ایک دو جملے تبدیل کرنا چاہتے ہیں اور میں نے مضمون نگار کی حیثیت سے اسے آپ کا حق سمجھا تھا،کوئی اعتراض نہ کیا تھا۔

جہاں تک نارنگ صاحب کی ذاتی زندگی کے حوالے سے بعض گوشوں کو سامنے لانے کا تعلق ہے،اسے نارنگ صاحب نے ری باؤنڈ پر حاصل کیا ہے۔آپ نے نارنگ صاحب کے دفاع کے نام پر وہ غلیظ مضمون شائع نہ کیا ہوتا تو عکاس کا نارنگ نمبر بھی نہیں آتا، یہ ذاتی باتیں بھی نہ آتیں۔سو اگر آپ نے وہ مضمون نارنگ صاحب کے اشارے پر شائع نہیں کیا تھا تو عکاس کے اس نارنگ نمبر کی اشاعت میں آپ کا ثواب بھی شامل ہے۔آنے والے وقت میں شاید آپ خود بھی اس بات پر خوش ہوں گے۔

آپ کے خط کا اصل حاصل یہ ہے کہ آپ کا اقتباس سیاق وسباق سے کاٹ کر پیش کیا گیا ہے۔سو یہ الزام سراسر بے بنیاد ہے۔میں نے آپ کا اقتباس سب کے سامنے پیش کر دیا ہے۔اس کا سیاق وسباق پیش کر کے اپنی سچائی ثابت کیجیے۔اس اقتباس سے وہی تاثر پیدا ہو رہا ہے جو آپ نے پیدا کیا تھا۔نارنگ صاحب کے سرقوں سے توجہ ہٹائے جانے والی غیر ضروری بحث سے صرفِ نظر کرتے ہوئے ان کے سرقوں کے مدلل ثبوتوں کا علمی مضمون کی صورت میں خود جناب نارنگ صاحب کا جواب ہی صورتحال کو واضح کرے گا۔کسی نیاز مند کے چند جملوں یا کسی بدزبان کی گالیوں سے نارنگ صاحب کے سرقوں کی بریت ممکن نہیں ہے۔

یہ جواب عجلت میں لکھ رہا ہوں، کہیں کوئی لفظ آپ کی نسبت سخت لکھا گیا ہو تو اس پر معذرت کیے لیتا ہوں۔آپ مجھے بہت عزیز ہیں،آپ نے دکھ بھی بہت دیا ہے لیکن آپ کا پہلا پیار بھی میرے لیے

بہت ہے۔اب بھی مجھے عزیز ہیں، میں آپ کی مجبوریوں کو بھی سمجھتا ہوں۔لیکن ہم اردو ادب میں سرقہ اور جعلسازی کے حوالے سے ایک تاریخی اور فیصلہ کن دور سے گزر رہے ہیں، یہاں کسی تاریخی غلطی کی گنجائش نہیں رہنی چاہیے۔اللہ آپ کو خوش رکھے۔آپ جن پریشانیوں اور مجبوریوں میں ہیں،ان سے آپ کو نجات عطا فرمائے۔آمین۔مجھ گنہگار کو بھی اپنی دعاؤں میں یاد رکھیے۔

آپ کا بھائی

حیدر قریشی

اس میل کا جواب نصرت ظہیر صاحب نے اگلے دن ۳۰ جون کو جرمن وقت کے مطابق رات کو آٹھ بج کر پینتالیس منٹ پر ریلیز کیا۔اور نصرت ظہیر صاحب کے جواب میں میں نے دو گھنٹے کے اندر دس بج کر چودہ منٹ پر اپنی میل ریلیز کر دی۔

نصرت ظہیر بنام حیدر قریشی۔۲

محترم حیدر صاحب، آداب!

آپ کے جواب میں کئی باتیں غیر درست اور غیر واضح ہیں،ان کی تصحیح کر لیجئے:

1۔ادب ساز کے گوشے پر نارنگ صاحب کے علاوہ اور کئی لوگوں نے بھی یہی بات پوچھی تھی کہ ان پر گوشہ کیوں؟ سب سے جواب میں میں نے وہی کہا جو ادب ساز میں لکھا تھا کہ برصغیر سے باہر زندگی گزارنے والے دو اہم ہندوستانی ادیبوں (ستیہ پال آنند اور آپ) پر گوشے نکالنا مقصود تھا اس لئے!

2۔نارنگ صاحب میرے بزرگ دوست ہیں۔انہوں نے نہ کبھی مجھ سے جواب طلبی کی نہ وہ خود کو اس کا مجاز سمجھتے ہیں کہ کسی سے جواب طلبی کریں۔انہوں نے ادب ساز میں بھی کبھی کوئی مداخلت نہیں کی اور نہ کبھی کریں گے۔

3۔جس مضمون کو آپ غلیظ کہہ رہے ہیں وہ تب موصول ہوا تھا جب رسالے کی اشاعت میں پہلے ہی کافی تاخیر ہو چکی تھی۔ پہلے مضمون نگار نے فون کیا تھا، تب انہیں بتایا گیا تھا کہ اگر وہ اپنا مضمون ای میل سے کمپوز کی ہوئی صورت میں بھیج دیں تو شاید وہ چھپ جائے کیونکہ رسالہ بہت لیٹ ہو چکا ہے۔انہوں نے جو فائل بھیجی وہ شاید کھلی نہیں۔تب انہوں نے دوبارہ مضمون بھیجا۔ اس مضمون میں خاصی کاٹ چھانٹ کی اور اس پر اپنی رائے بھی چھاپ دی تھی۔نارنگ صاحب اس بیچ میں نہ کہیں تھے نہ ہیں۔آپ دراصل نارنگ دشمنی کے زہریلے نشے میں پوری طرح ڈوبے ہوئے ہیں۔ اور اس میں آپ کو سب کچھ ویسا ہی دکھائی دے رہا ہے جو آپ دیکھنا چاہتے ہیں اور جس سے آپ کا نشہ اور گہرا ہو جائے۔نہ وہ شمارہ اس مضمون کی وجہ سے لیٹ کیا گیا نہ ایسا کرنے کا کوئی جواز تھا۔

4۔سرقے کے معاملے میں نارنگ صاحب اپنی پوزیشن پہلے ہی واضح کر چکے ہیں جو ظاہر ہے آپ کی سمجھ میں کبھی نہیں آئے گی کیونکہ آپ نے تو نیت باندھ رکھی ہے ان کی مخالفت، اور شمس الرحمٰن فاروقی صاحب کے ذاتی متعصّبانہ ایجنڈے کو پورا کرنے کی۔

5۔میرا مزاحیہ مضمون شمع اور دیگر اردو رسائل میں کسی زمانے میں چھپنے والے ادبی معموں اور اس سے جڑی ہوئی 'اردو صنعت' کے بارے میں تھا اور میری تازہ ترین کتاب 'نمی دانم' میں بھی شامل ہے جو پینگوئن بکس نے چھاپ دی ہے اور جس کے بیک کور پر میرے بارے میں نارنگ صاحب نے توصیفی کلمات سے بھی نوازا ہے۔یہ مضمون اس سے پہلے بھی کئی جگہ چھپ چکا ہے، کئی مجلسوں میں پڑھا جا چکا ہے، ریڈیو پر بھی آیا ہے، مگر کبھی کسی نے یہ بات نہیں سوچی جو آپ نے سوچ لی۔میں نے کسی شخصیت کا نہیں شخصیتوں کا ذکر کیا تھا۔صیغہ جمع میں۔دھوکا دنیا کو میں نہیں آپ دے رہے ہیں۔چنانچہ نارنگ صاحب کے عتاب سے بچنے کی کوشش والی آپ کی بات، آپ کے خط کا سب سے مضحکہ خیز جملہ ہے۔شاید آپ بھی اس جملے کی مضحکہ خیزی کو محسوس کر رہے ہوں۔

6۔فاروقی صاحب نے جب 'اردو درپن' صرف نارنگ دشمنی کی وجہ سے بند کرایا تھا تب میں قومی

آواز کے چیف رپورٹر کے عہدے پر فائز تھا اور بے روزگاری کا کوئی سوال ہی نہیں تھا۔کوئی اور ملازم بھی بے روزگار نہیں ہوا تھا۔یاد کیجئے آپ کو کسی اور بات پر دکھ ہوا ہوگا۔میں اس رسالے کا اعزازی مدیر تھا اور چونکہ اسے ایک یادگار مجلّہ بنانے کی کوشش میں خود کو جذباتی حد تک involve کر چکا تھا اس لئے رسالے کے بند ہونے کا مجھے اس قدر صدمہ پہونچا کہ دو روز تک قومی آواز کے دفتر بھی نہیں گیا۔فاروقی صاحب کس قدر بدطینت اور لسانی تعصب میں مبتلا شخص ہیں یہ میں اچھی طرح جان گیا تھا۔تب ان کا شب خون زندہ تھا اور وہ عرصے سے اردو درپن کے خلاف محاذ کھولے ہوئے۔ان کا دعویٰ تھا کہ اردو کے کسی ادارے سے ہندی رسم الخط میں کوئی رسالہ نکالنے کا مطلب یہ ہے کہ حکومت اردو کا رسم الخط بدلنا چاہتی ہے۔حالانکہ رسالے میں ہندی والوں کو اردو سکھانے کے لئے ایک سبق لازمی طور سے چھاپا جاتا تھا اور یہ اشتہار بھی کہ اردو زبان کی شیرینی کا ذائقہ چکھنے کے لئے اسے اس کے رسم الخط میں پڑھنا ضروری ہے، ہر شمارے میں ہوتا تھا۔مگر بد قسمتی سے وہ سبق اور اشتہار میں ہندی و انگریزی سے اردو سکھانے والی، اردو کونسل کی جن کتابوں کو خریدنے کی سفارش کی جاتی تھی وہ نارنگ صاحب کی لکھی ہوئی تھیں۔آپ چونکہ اندھی نارنگ دشمنی میں مبتلا ہیں اس لئے اس بات کا بھی یقین نہیں کریں گے کہ فاروقی صاحب نے کونسل کا وائس چیئر مین بننے کے بعد ان کتابوں کی فروخت بھی بند کرادی تا کہ نارنگ صاحب کو اس کی رائلٹی نہ مل سکے۔اس کی جگہ انہوں نے خود اپنی لکھی ہوء اردو سکھانے کی کتابیں کونسل کی طرف سے رائج کرانے کا ڈول ڈال دیا، تا کہ اب رائلٹی انہیں ملا کرے۔خیر، آج پہلی بار سرِ عام بتا رہا ہوں کہ سخت ڈپریشن کے ان دنوں میں ہی میں نے 'ادب ساز' کے اجرا کا پلان بنایا تھا۔تب میں نے دو عہد کئے تھے۔ایک یہ کہ 'اردو درپن' کے بند ہونے کا شکوہ کسی سے نہیں کروں گا۔ فاروقی صاحب سے بھی نہیں۔اور دوسرا یہ کہ 'ادب ساز' کو اس قدر معیاری بنا کر دکھاؤں گا کہ فاروقی صاحب جل بھن کر اور پیچ و تاب کھا کر رہ جائیں۔ یہ میرا انتقام لینے کا اپنا طریقہ تھا اور مجھے اطمینان ہے کہ میں کامیاب رہا۔میں چاہتا تو میڈیا سے اپنی دیرینہ وابستگی کا استعمال کرتے ہوئے ان کے خلاف اخبارات میں اچھی خاصی تحریک چلا سکتا تھا۔مگر میں نے ایسا

نہیں کیا۔ فاروقی صاحب کو پہلی اخلاقی ہزیمت تب ہوئی جب میں نے ان سے ادب ساز کے پہلے شمارے لئے کچھ لکھنے کی گزارش کی۔انہوں نے پوچھا کہ کیا اس میں نارنگ کا بھی کچھ چھپے گا؟ میں نے بتایا کہ یقیناً چھپے گا۔تب انہوں نے کہا کہ وہ ایسے کسی رسالے میں نہیں چھپنا چاہتے جس میں نارنگ کا بھی کچھ شائع ہو۔اسکے بعد کا سارا قصہ 'نیا ورق' میں چھپ چکا ہے۔میرا انتقام تب پورا ہوا جب 'ادب ساز' کا پہلا شمارہ سامنے آیا اور نارنگ صاحب کے ہاتھوں اس کا اجرا ہوا۔اور یقین کیجئے نارنگ صاحب کے فرشتوں کو بھی یہ معلوم نہیں تھا کہ اس شمارے میں کیا چھپا ہے اور رسالہ کس وجہ سے نکالا گیا ہے۔انہیں رسالے کی اشاعت کا علم بھی اس روز ہوا جب میں نے ان سے اجرا کی درخواست کی۔یہاں تک کہ فاروقی صاحب سے کس بات پر کس لئے بگاڑ ہوا یہ قصہ بھی انہیں 'نیا ورق' سے معلوم ہوا۔

7۔اب رہ گئی انسانی کردار کی بات۔میرا اس بات پر مکمل یقین ہے کہ اچھے سے اچھے آدمی میں کوئی نہ کوئی برائی ضرور ہوتی ہے اور برے سے برے آدمی میں بھی کوئی نہ کوئی اچھی بات ضرور مل جاتی ہے ۔چنانچہ نارنگ صاحب میں بھی کوئی نہ کوئی خامی ضرور ہوگی اور فاروقی صاحب میں بھی کوئی نہ کوئی اچھی بات ضرور مل جائے گی۔

8۔ادب میں سرقے اور جعل سازی کے خلاف آپ کے جہاد کی بات مجھے ایک ستم ظریفی سے زیادہ کچھ نہیں لگتی کیونکہ ابھی تو ادب ہی تخلیق نہیں ہو رہا ہے۔ادب تخلیق ہوگا تبھی تو کوئی سرقہ یا جعل عمل میں لایا جا سکے۔

9۔اور ہاں عرض یہ ہے کہ میری پریشانیاں صرف اس لئے ہیں کہ میرے پاس کام بہت ہے کرنے کو۔گزشتہ سال قومی آواز بند ہونے پر مجھ سمیت سبھی ملازمین کو ایک بہترین VRS ملا تھا اور آج کل میں سہارا اردو نیوز چینل کی ملازمت میں ہوں۔

نصرت ظہیر

حیدر قریشی بنام نصرت ظہیر۔۲

برادرم نصرت ظہیر صاحب سلام مسنون

پہلے تو خوشی اس بات کی ہوئی کہ اپنی پہلی ای میل کے مقابلہ میں اس بار آپ میرے لیے کچھ نرم ہوئے ہیں۔آپ کی موجودہ وضاحتوں میں کہیں کہیں کچھ ہلکے پھلکے سے سقم دکھائی دے رہے ہیں۔سو آپ کے دیئے ہوئے نمبرز کے مطابق اسی ترتیب سے اپنا جواب پیش کر رہا ہوں۔تا کہ یہ سب کچھ ریکارڈ پر رہے۔

۱۔پہلے نکتہ میں آپ کی موجودہ وضاحت سے کافی حد تک مختلف بات آپ اپنی ایک ای میل (۲رفروری۲۰۰۹ء) میں لکھ چکے ہیں اور یہی اصل حقیقت ہے۔

''آپ کے گوشہ کی بات یہ ہے کہ جب وہ چھپ رہا تھا تو تب نارنگ صاحب نے اس کا علم ہونے کے باوجود مجھ سے نہیں پوچھا تھا کہ کیوں چھاپ رہے ہو۔جب چھپ چکا تو اس کے بھی تین چار ماہ بعد ایک دن انہوں نے پوچھا کہ یہ تو بتاؤ حیدر قریشی کہاں سے تمہارا ایسے دوست بن گیا کہ ان کا گوشہ چھاپ دیا۔ان سے اتنا گہرا تعلق کب ہوا تمہارا؟ میں نے سچ باتیں بتا دیں اور یہ بھی کہ میں انڈیا، پاکستان سے باہر رہنے والے دو ادیبوں پر گوشے چھاپنا چاہتا تھا،ستیہ پال آنند کے مقابل مجھے حیدر قریشی زیادہ سوٹ کرتے ہیں''

یہ صرف آپ کی تحریری بات ہے وگرنہ زبانی اس سے بھی زیادہ محبت کے ساتھ آپ نے کچھ کہا تھا۔

۲۔نارنگ صاحب نے جواب طلبی کی یا نہیں،مذکورہ اقتباس سے کچھ تو اندازہ کیا جا سکتا ہے۔سو اوپر والا اقتباس ہی اس کا جواب ہے۔

۳۔جس غلیظ مضمون کی اشاعت میں نارنگ صاحب کے کردار سے آپ یکسر انکار کر رہے ہیں (۲رفروری والی ای میل میں ہی آپ یہ لکھ چکے ہیں۔

''آپ نے مجھ سے کہا تھا کہ اس مضمون کے پیچھے نارنگ صاحب کا ہاتھ ہے۔میں نے کہا میں بھی

یہی سمجھتا ہوں۔میں نے شاید یہ بھی کہا کہ میں جانتا ہوں۔''

آپ ہی اپنے لکھے پر غور کریں۔میں پھر کہتا ہوں کہ یہ مضمون آپ نے شائع نہ کیا ہوتا تو عکاس کا نارنگ نمبر بھی نہیں چھپتا۔میں تو جدید ادب کے شمارہ بارہ پر نارنگ صاحب کی پے در پے سنسر شپ کے باعث،اپنی داستان ریکارڈ پر لا کر اس موضوع کو ہی چھوڑ چکا تھا۔یہ تو آپ نے مجھے اور میرے دوستوں کو متحرک کر کے یہ نیک کام کرنے پر مجبور کر دیا۔

۴۔میں حلفیہ کہتا ہوں کہ میرا ایک عرصہ سے فاروقی صاحب سے کسی نوعیت کا رابطہ نہیں رہا۔(صرف آج آپ کی کل والی میل کا جواب انہیں بھیجا ہے)۔فاروقی صاحب کے کسی ایجنڈے سے مجھے کوئی غرض نہیں۔میری طرف سی سیدھی سی بات ہے کسی نے سرقہ کیا ہے تو اسے ادبی کٹہرے میں لانا چاہیے۔یہ صرف نارنگ صاحب کے لیے نہیں ہے، میں گزشتہ دس برسوں سے مغربی دنیا کے ایسے کرداروں کو بساط بھر بے نقاب کر رہا ہوں۔اور حسبِ توفیق گالیاں کھا رہا ہوں۔اگر نارنگ صاحب نے اپنے سرقوں کی کوئی وضاحت کر دی ہے تو اسے پورے دلائل کے ساتھ سامنے لایا جائے۔ان کی وضاحت کہاں چھپا کر رکھی ہوئی ہے؟

۵۔آپ نے پہلے لکھا تھا کہ میں نے آپ کی تحریر کو سیاق و سباق سے کاٹ کر پیش کیا ہے۔میں نے آپ کی تحریر سامنے رکھ دی کہ اسے اصل سیاق سباق کے ساتھ پیش کیجیے۔لیکن آپ نے ابھی تک یہ کام نہیں کیا۔اس سے کیا تاثر بنتا ہے، یہ قاری پر چھوڑ دیجیے۔مزاحیہ تحریروں میں ہر طرح کی بات کہہ دی جاتی ہے اور پھر بھی ہر طرح کی گنجائش رکھ لی جاتی ہے۔سو آپ اپنے مفہوم پر مطمئن رہیے، قاری کو اپنی مرضی سے کسی مفہوم تک پہنچنے دیجیے۔قاری کافی ذہین ہو چکے ہیں۔

۶۔فاروقی صاحب نے آپ کے ساتھ یا کسی کے ساتھ کیا دشمنی کی۔۔۔اس میں کہیں ادبی جعلسازی یا سرقے وغیرہ کا معاملہ ہے تو میں آپ سے بڑھ کر آواز اُٹھانے کو تیار ہوں لیکن اگر معاملہ کچھ ذاتی نوعیت کی رنجشوں کا ہے تو آپ جانیں۔فاروقی صاحب جانیں اور نارنگ صاحب جانیں۔البتہ اب مجھے فاروقی صاحب کے نام کے صوتی حوالے سے یونہی طنز و مزاح والی بات سوجھی ہے کہ اپنے بے پناہ سرقوں کے باعث نارنگ صاحب کو''ساروقی'' کا اعزاز دیا جانا

چاہیے۔لیکن اس موازنۂ فاروقی و ساروقی سے مجھے کچھ لینا دینا نہیں ہے۔تاہم مزاح نگار ہوتے ہوئے بھی آپ اس مزاح سے رنجیدہ ہوں تو اپنے الفاظ''ساروقی'' واپس لیتا ہوں۔

۷۔آپ کی اس بات سے میں مکمل اتفاق کرتا ہوں۔ہم سب انسان خوبیوں اور خامیوں کا مجموعہ ہیں۔کسی میں خوبیوں کا پلڑا بھاری ہو جائے اتنا بھی کافی ہے۔

۸۔اس میں شک نہیں کہ اردو میں بے شمار ٹریش چھپ رہا ہے(بیرون ملک ٹریش اور جعلی لکھنے والوں کی بڑی تعداد کی سرپرستی نارنگ صاحب ہی فرماتے ہیں۔کہیں تو میں ایک سرے سے نام گنوانا شروع کر سکتا ہوں) لیکن اچھا ادب بھی تخلیق ہو رہا ہے۔لیکن اگر آپ کے بقول اچھا ادب تخلیق نہیں ہو رہا تب بھی نارنگ صاحب تو جعل اور سرقہ دونوں کارہائے نمایاں سرانجام دے چکے ہیں۔یہ تو مزید افسوس کی بات ہے کہ اچھا ادب تخلیق نہیں ہو رہا لیکن نارنگ صاحب پھر بھی سرقہ کیے جا رہے ہیں۔

۹۔اللہ آپ کے رزق میں برکت دے اور آپ کو مزید مالا مال کرے۔اور درویش کی دعا کیا ہے!

آپ کا بھائی

حیدر قریشی

اس میل کا جواب نصرت ظہیر صاحب نے پھر اگلے دن جرمن ٹائم کے مطابق یکم جولائی کو رات آٹھ بج کر پینتالیس منٹ پر ریلیز کیا اور میں نے دو گھنٹے دو منٹ کے بعد اس کا جواب بھی جاری کر دیا۔

نصرت ظہیر بنام حیدر قریشی۔۳

حیدر صاحب آداب!

ایسا لگتا ہے آپ زندگی بھر دوسروں کے سقم ہی ڈھونڈتے رہیں گے۔

1۔میری وضاحت اورآپ کےنقل کردہ میرے ای میل کے اقتباس میں کیا اختلاف ہے،سوائے اس فرق کے کہ وضاحت میں اختصار ہےاوراقتباس میں اسی بات کی تھوڑی سی تفصیل آ گئی ہے؟ البتہ'حیدرقریشی کہاں سےتمہارا دوست بن گیا... 'یہ اندازِتخاطب نارنگ صاحب کانہیں آپ کا مفروضہ ہے۔انہوں نے مہذب انداز میں پوچھا تھااور میں نے ویسے ہی لکھا تھا،مگرآپ نے اقتباس میں اسے بدل دیا۔صرف اپنے لئے ہمدردی حاسل کرنے کی غرض سے!

2۔'جواب طلبی' کاطعن کسنے سے شاید آپ کوکسی قسم کا ذہنی سکون ملتا ہے۔کستے رہئے...اللہ شفا دے گا۔

3۔جی ہاں میں نے یہی لکھا تھا اور اس کے بعد یہ بھی کہ' مگر یہ بھی سچ ہے کہ انہوں (نارنگ صاحب) نے یہ مضمون مجھےنہیں بھیجا۔' آگے چل کر یہ بھی لکھا کہ نارنگ صاحب نے مجھ سے کبھی یہ خط یا کسی کا مضمون چھاپنے کے لئےنہیں کہا۔سچ تو یہ ہے کہ مدیر کی domain میں دخل انداز ہونا ان کا شیوہ ہی نہیں ہے۔مگر یہ آپ جواب الجواب میں قصداً گول کر گئے۔یہ جھوٹ ہے،جعل ہے،یا فریب دہی۔آپ خود ہی طے کیجئے۔میں اب بھی اسے آپ کا سہو ماننے کو تیار ہوں۔شمارہ بارہ پرنارنگ صاحب کی سنسر شپ والی بات میری سمجھ سے باہر ہے۔

4۔حلف اٹھانے کی ضرورت نہیں، میں خود سچّا آدمی ہوں اس لئے دوسروں پر بھی یقین کرتا ہوں۔مجھےآپ کےاندازِ بیان سےاوربعض باتوں پراصرار سےشبہ ہورہا تھا کہ آپ شاید فاروقی صاحب کے اثر میں ہیں جن کا ون پوائنٹ ایجنڈا آج کل صرف یہ ہے کہ نارنگ صاحب کو defame کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سےنہیں نکلنے دینا چاہئے۔مجھےآپ کی بات کا یقین ہے۔ تاہم نادانستہ طور پرسہی آپ آج کل ان ہی کا ایجنڈا پورا کررہے ہیں۔

5۔میرا مضمون بہت بار چھپ چکا ہے۔ملک کے طول وعرض میں لاکھوں نہیں تو ہزاروں اردو والےضرور ہر ہفتے میرے مزاحیہ مضمون پڑھتے ہیں اور وہ بھی کافی ذہین ہیں۔سیاق وسباق میں پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ ادبی معموں کی صنعت پرمضمون لکھا گیا تھا جسے نارنگ صاحب نے بھی پسند کیا تھا۔اب سیاق وسباق اس کا آپ نے بدلا ہےاسے نارنگ مخالف نمبر میں چھاپ کرتا کہ

لوگ اسے نارنگ مخالف تحریر سمجھیں۔

6۔فاروقی صاحب نے میرے ساتھ کوئی نجی قسم کی ذاتی دشمنی نہیں کی۔لیکن وہ دھوکے باز ہیں۔ پہلےانہوں نےسی آئی اے کا ایجنڈا پورا کرتے ہوئے ترقی پسندی کے خلاف جدیدیت کا جھنڈا لہرا کر اردو ادیبوں کودھوکا دیا اور گمراہ کیا۔اردو درپن کے معاملے میں رسم الخط بدلنے کے جھوٹ پر مبنی تحریک چلا کر لسانی تعصب کو ہوا دی ،گیان چندجین کی کتاب پر یک طرفہ تنقید لکھ کر اردو سماج کو مذہب کی بنیاد پر تقسیم کرنے کا مذموم چکّر چلایا جس کی پول کھل چکی ہے کہ اس میں بھی بنیادی غرض نارنگ صاحب کو رسوا کرنے کی تھی۔اُس گوپی چند نارنگ کو یہ طالبانی نقاد جن سنگھی فرقہ پرست گردانتا ہے جس نے ولی دکنی کے مزار کو مسمار کرنے کے خلاف آواز اٹھائی اوراین ڈی اے کے ہی دور میں ساہتیہ اکادمی کے ایک سیمینار میں اس مزار کو بحال کر کے وہاں ولی دکنی کی یادگار قائم کرنے کی قرارداد منظور کرائی تھی۔اس وقت گیان چندجین کی کتاب کے خلاف اسلامی جھنڈا لہرانے والا اردو ادب کا یہ جیالا بقراط اور سرسوتی سمّان فاروقی کیا کر رہا تھا؟ وہ جن سنگھی وزیرتعلیم مرلی منوہر جوشی کو مولانا ابوالکلام آزاد کے بعد سب سے بڑا دانشور قرار دے رہا تھا تا کہ اس کی بیوی کے اسکول کو اچھی سی مالی امداد مل جائے۔مگرآپ اس کذب،اس فریب اوراس کفر کے خلاف کہاں آواز اٹھائیں گے۔ہاں فاروقی صاحب کے یہاں کوئی ایسا سہو یا کوتاہی آپ کو مل جائے جسے آپ اپنی دانست میں ادبی سرقہ کہہ سکیں تو آپ زمین آسمان ایک کردیں گے۔فاروقی صاحب کو مجھ سےکوئی ذاتی پرخاش ہوگی یہ میں نہیں جانتا۔البتہ میں ان سے ذاتی پرخاش اس لئے رکھتا ہوں کہ وہ، مذہبی،لسانی اور تہذیبی رواداری اور pluralism اشتراکیت ومساوات کی قدروں کے دشمن ہیں جنہیں میں اپنا آدرش سمجھتا ہوں۔یہاں میں کسی سے سمجھوتہ نہیں کرسکتا۔سی پی آئی اور سی پی ایم جیسے کمیونسٹوں سے بھی نہیں۔مجھےآپ سے مدد نہیں چاہئے۔میری ترجیہات میرے ساتھ ہیں آپ کی آپ کے ساتھ۔دونوں میں خاصا فرق ہے۔

باقی باتیں وضاحت طلب نہیں ہیں۔آخر میں میرا مخلصانہ مشورہ ہے کہ اپنے شعور ولاشعور کو اس آشوبِ چشم سے بچائیے جوآپ کولوگوں کی شخصیتوں اور کرداروں کے درست رنگ پہچاننے سے

روک رہا ہے۔اپنے دل میں سوز وگداز پیدا کیجئے۔صرف اپنی ذات پر ساری توجہ کو مرکوز نہ رکھئے۔ا
س گلشنِ ہستی میں بہت کچھ اچھا بھلا موجود ہے۔اس کا لطف اٹھائیے۔یہ نصیحتیں اس لئے بھی کر رہا
ہوں کہ عمر میں آپ سے ایک ڈیڑھ برس بڑا ہوں۔

نصرت ظھیر

حیدر قریشی بنام نصرت ظہیر۔۳

برادرم نصرت ظھیر صاحب!

سلام مسنون

آپ کی ای میل کے صرف ایک نکتے کے سلسلہ میں وضاحت کرتا ہوں کہ نہ یہ مفروضہ ہے، نہ میں نے اپنی طرف سے کچھ لکھا ہے۔نارنگ صاحب کا انداز تخاطب ایسا ہے یا نہیں، آپ بہتر جانتے ہیں لیکن آپ نے مجھے ان سے متعلق یہ بات اسی طرح لکھی تھی۔آپ کی ۲ فروری والی ای میل جو رومن اردو میں تھی اس کے من وعن الفاظ یہ ہیں:

Aap ke goshe ki baat ye he ke jab wo chhap raha tha tab Narang sb ne iska ilm honay ke bawajood mujh se nahi poochha ke kyun chhaap rahe ho. Jab chhap chuka to us ke bhi 3-4 maah baad ek din unhon ne poochha ke ye to batao Haider Qureshi kahaan se tumhaare ese dost ban gae ke un ka gosha chhaap diya. Un se itna gehra talluq kab hua tumhara. Maen ne sach baaten bata deen. Aur ye jawaaz bhi ke maen India Pakistan se baahar rehne waale do adeebon par goshe chhaapna chahta tha. S P Anand Sb ke muqabil mujhe HaiderQureshi ziyada suit karte they.

آپ زبانی کہی باتوں سے تو بات کو گول مول کر سکتے ہیں لیکن اپنے لکھے سے کیسے مکر سکتے ہیں؟اسی بات کو میں نے اردو اسکرپٹ میں یوں لکھا ہے:

”آپ کے گوشہ کی بات یہ ہے کہ جب وہ چھپ رہا تھا تو تب نارنگ صاحب نے اس کا علم ہونے کے باوجود مجھ سے نہیں پوچھا تھا کہ کیوں چھاپ رہے ہو۔جب چھپ چکا تو اس کے بھی تین چار ماہ بعد ایک دن انہوں نے پوچھا کہ یہ تو بتاؤ حیدر قریشی کہاں سے تمہارا ایسے دوست بن گیا کہ ان کا گوشہ چھاپ دیا۔ان سے اتنا گہرا تعلق کب ہوا تمہارا؟میں نے سچ باتیں بتا دیں اور یہ بھی کہ میں انڈیا، پاکستان سے باہر رہنے والے دو ادیبوں پر گوشے چھاپنا چاہتا تھا،ستیہ پال آنند کے مقابل مجھے حیدر قریشی زیادہ سوٹ کرتے ہیں“

میری طرف سے کوئی مفروضہ پیش نہیں کیا گیا۔آپ سے پوری طرح جواب طلبی ہوئی،اب اسے کہاں تک چھپائیں گے اور کیسے چھپائیں گے؟

برادرم!

آپ کی طرف سے ایک اہم،اصل اور بنیادی بات تھی کہ مابعد جدیدیت کے حوالے سے آپ کے مزاحیہ اقتباس کو سیاق وسباق سے الگ کر کے پیش کیا گیا۔میں نے آپ کا اقتباس پیش کر دیا کہ اسے اس کے اصل سیاق سباق کے ساتھ سامنے لائیے۔آپ اس میں ناکام رہے ہیں۔وہ اقتباس پھر پیش کرتا ہوں۔

”اردو زبان وادب کی جتنی خدمت ادبی معموں نے کی ہے اتنی ہمارے خیال سے کسی نے بھی نہیں کی ہوگی۔یہاں معموں سے ہماری مراد وہ چلتی پھرتی محترم شخصیتیں ہرگز نہیں ہیں جن کے نام کے ساتھ پروفیسر یا ڈاکٹر کا لاحقہ جڑا رہتا ہے اور جنہوں نے جدیدیت،مابعد جدیدیت اور ساختیات وپسِ ساختیات کے چکر میں ڈال کر خود اردو ادب کو ایک معمہ بنا ڈالا ہے۔۔۔۔اُس زمانے میں ادبی معمے اردو والوں کو اور بھی کئی خرافات سے دور رکھتے تھے۔نہ انہیں اس کی فکر رہتی تھی کہ کس اردو اکادمی نے اس مرتبہ کس غیر مستحق ادیب کو ایوارڈ سے نوازا ہے اور نہ وہ اس بحث میں پڑتے تھے کہ مابعدالجدیدیت اور ساختیات وپسِ ساختیات کی اوّلین دریافت کا سہرہ کس کے سر باندھا جائے۔نیز یہ کہ جدیدیت کے بعد مابعد جدیدیت آئی ہے تو کیا اس اصول کے تحت مابعد جدیدیت کے بعد ما مابعد جدیدیت آئے گی؟اور کیا سن ۲۱۵۵ء تک آتے آتے اردو ادب میں مامامامامامابعد جدیدیت پڑھی جا رہی ہوگی؟“

(**نصرت ظھیر** کے طنزیہ **اردو کے ادبی معمے** سے اقتباس)

اس کا سیاق وسباق سے الگ ہونا ثابت کرنا آپ کی ذمہ داری ہے ورنہ حقیقت سب پر ظاہر ہے،حتیٰ کہ نارنگ صاحب پر بھی ظاہر ہے۔

پہلے آپ نے غیر ذمہ دار مدیر کے طور پر ایسی صورتحال پیدا کر دی کہ عکاس کا نارنگ نمبر چھاپنا واجب کر دیا۔اب آپ کی مسلسل کوشش ہے کہ نارنگ صاحب کے سرقوں سے توجہ ہٹا کر دوسری غیر متعلق باتوں میں سرقے کی بات گول کر دی جائے۔لیکن آپ کی اس کوشش سے بھی نارنگ صاحب ہی کا مزید تماشہ بن رہا ہے۔میں نارنگ صاحب کے سرقوں کے ڈھیروں ڈھیر اقتباسات کو چھوڑ کر صرف تین بڑے سرقوں پر آپ کو روک چکا ہوں کہ ان کا جواب دلایئے۔

۱۔نارنگ صاحب کی کتاب کے صفحہ نمبر ۳۳ سے لے کر ۳۴۳ تک صرف بیس صفحات بھی ایسے نہیں ہیں جو انگریزی کتابوں کا لفظ بلفظ ترجمہ نہ ہوں۔۲۔رامن سیلڈن کی کتاب Contemporary Literary Theory سے جو سرقہ کیا گیا ہے وہ ساٹھ صفحات سے بھی زیادہ ہو گیا ہے۔۳۔ٹیرنس ہاکس کی کتاب Structuralism and Semiotics پیراگرافس کے معمولی ادل بدل کے ساتھ پوری کی پوری اپنی کتاب میں شامل کر لی ہے۔

دوسال سے زائد عرصہ ہو چلا ہے لیکن نارنگ صاحب ابھی تک اپنے سرقوں کے بارے میں کھل کر کچھ بھی نہیں کہہ سکے۔آپ اس الزام کا علمی جواب لایئے۔

آپ کے ساتھ موجودہ خط وکتابت اب ادبی ریکارڈ کا حصہ بن گئی ہے اور افسوس کہ آپ نہ تو اپنے اقتباس والا الزام ثابت کر سکے اور نہ نارنگ صاحب کے کوہ ہمالیہ جیسے سرقوں سے بریت کے لیے کوئی علمی دلیل لا سکے۔بہت سارے حقائق کو ادبی دنیا بہتر طور پر سمجھ رہی ہے۔اب پہلے یہ دو معاملات طے کر لیں پھر کسی اور طرف چلیں گے۔

آپ کا بھائی **حیدر قریشی**

اس کا جواب بھی حسبِ سابق نصرت ظہیر صاحب نے اگلے روز ۲/جولائی ۲۰۰۹ء کو رات نو بجے

کر انتیس منٹ پر جاری کیا اور چند اٹ پٹی باتوں کے ساتھ مزید بحث سے انکار کر دیا۔یہ میل انہوں نے اوپن طور پر بھی جاری کی اور مجھے ذاتی طور پر الگ سے بھی بھیجی۔اس کے جواب میں انہیں میں نے ذاتی طور پر رات کے ۱۰ بجے کر آٹھ منٹ پر میل بھیجی۔اور ۱۰ بجے کر ۲۹ منٹ پر اوپن میل بھی ریلیز کر دی۔

نصرت ظہیر بنام حیدر قریشی۔۴

حیدر صاحب

آداب

پہلے آپ کی باتیں پڑھ کر کسی قدر غصہ آیا تھا۔پھر ہنسی آئی۔اور اب اپنی عقل پر اور آپ کے سوچنے کے ڈھنگ پر رونا آ رہا ہے۔اپنی عقل پر یوں کہ مجھے پہلے ہی سمجھ لینا چاہئے تھا کہ اتنے عرصے سے نارنگ صاحب سے پرخاش رکھنے کے بعد آپ میری بات قطعی نہیں سمجھیں گے۔نارنگ صاحب کو کسی بھی طرح نیچا دکھانا اب آپ کا ذہنی مرض اور obsession بن چکا ہے چنانچہ اب آپ کو آپ کے حال پر چھوڑ دینا چاہئے۔آپ کی فہم پر ترس آنے کی وجہ یہ ہے کہ آپ اس ای میل میں اپنی اور میری ای میل کے اقتباس نقل کر کے بھی نہیں سمجھ پا رہے ہیں کہ آپ کی عبارت 'حیدر قریشی کہاں سے تمہارا ایسا دوست بن گیا...' اور میرے تحریر کردہ **Haider Qureshi kahaan se tumhaare ese dost ban gae** میں جملے کی ساخت اور تخاطب کی شائستگی میں جو فرق موجود ہے اس کے لئے کون ذمہ دار ہے؟ اس پر پھر وہی مرغی کی ایک ٹانگ کہ یہ جواب طلبی ہے! چلئے مان لیا۔جی ہاں انہوں نے جواب طلبی کی تھی۔کان بھی اینٹھے تھے۔اب آپ خوش ہیں؟

اس کے بعد پھر میرے مضمون پر تکرار۔بھائی صاحب اب کیا چیخ چلاّ کر کہوں کہ اس مضمون

میں نارنگ صاحب کونہیں ادبی نظریہ سازی اورتھیوری بازی کوطنزومزاح کا نشانہ بنایا گیا تھا جن
سے ادب بجائے خود ایک معمہ محسوس ہونے لگتا ہے۔ میں بات ادبی معموں کی کر رہا تھا اور آپ
نے اسے نارنگ صاحب پر چپکا دیا۔ یہ ہے آپ کی بددیانتی۔ اپنا سیاق وسباق میں پہلے ہی بتا چکا
ہوں۔ اب آپ کی سمجھ میں نہیں آ رہا ہے تو میں کیا کر سکتا ہوں۔
آخر میں یہ کہ جناب اب بہت ہوا۔ اب یہ کشتی اور پہلوانی بند کیجئے۔ مجھے ادب ساز کے موجودہ
شمارے میں ہونے والی تاخیر کی فکر کھائے جا رہی ہے اسے پورا کر لینے دیجئے۔ اور خدا کے لئے
خود بھی کسی ڈھنگ کے کام میں لگیئے۔ آئندہ آپ مجھے اس سلسلے میں کوئی خط نہ لکھیں۔ لکھیں
گے تو میں کوئی جواب نہیں دوں گا۔ مجھے آپ کے ایجنڈے سے کوئی دل چسپی نہیں ہے۔ لہٰذا اس
سلسلے میں مجھے معاف فرمائیں، اور میرے بارے میں جو آپ کے جی میں آئے وہ سوچ کر اپنا
دل بہلاتے رہیں۔ خدا حافظ۔
یار زندہ صحبت باقی۔

نصرت ظہیر

حیدر قریشی بنام نصرت ظہیر۔۴

ذاتی میل

بھائی صاحب!

یہی بات آپ نے شروع میں پبلک میں جا کر کرنے کی بجائے ایک بار مجھ سے ڈائریکٹ کر لی
ہوتی تو اتنا تماشہ کیوں لگتا۔ میں نے اپنے خطوط میں حوالہ جات دیئے ہیں، کمینٹس کم کیے
ہیں۔ اس لیے کہ مجھے آپ کی ذات کا ابھی بھی لحاظ ہے، وگرنہ جو مراسلت ہو چکی ہے، اس پر ہی
لوگ کسی فیصلہ پر آسانی سے پہنچ سکتے ہیں۔ چلیں اب ایک فیور دیں۔۔ مجھے اپنے چاروں خطوط

ان پیج میں فراہم کر دیں۔ شکر گزار رہوں گا۔ جنگ لندن میں آج ہی میرا تبصرہ چھپا ہے اور آپ اس
کے بعض حصوں سے پہلے ہی واقف ہیں کہ آپ سے مراسلت میں بیان ہو چکے ہیں۔
ایک بات ذہن میں صاف کر لیں۔ سرقے والے اِشو میں فاروقی صاحب کا نہ کوئی کردار ہے اور
نہ اس اِشو کا معرکۂ نارنگ وفاروقی سے کوئی تعلق ہے۔
ان پیج فائلز کا انتظار کروں؟
آپ کا پرانا بھائی

حیدر قریشی

انٹرنیٹ کے ذریعے یہ **اوپن میل** جاری کی گئی۔

نصرت ظہیر صاحب نے بحث ختم کر دی ہے۔ میں نے انہیں ذاتی طور پر ای میل بھیج دی ہے سو اب
نصرت ظہیر صاحب والی بحث ختم ہوئی۔ جو کچھ آن ریکارڈ ہے وہ اب پبلک پراپرٹی ہے۔ آج
روزنامہ جنگ لندن کے ادبی صفحہ پر میرا تبصرہ شائع ہوا ہے۔ اخبار کا تراشہ منسلک ہے اور یہ بحث
کے اختتامیہ کے طور پر ہے۔ **حیدر قریشی**

(جنگ لندن میں چھپنے والا یہ تبصرہ اسی کتاب کے صفحہ نمبر ۲۹ پر موجود ہے)

ڈاکٹر نارنگ کے سرقوں کے دفاع کی مہم

اتفاقیہ یا منصوبہ بند کاروائی؟

ارشد خالد کے ادبی کتابی سلسلہ عکاس انٹرنیشنل اسلام آباد کے ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نمبر کے شائع ہونے کے بعد سے لے کر اب تک نارنگ صاحب نے اپنے سرقوں کے حوالے سے کوئی جواب نہیں دیا،کوئی وضاحت نہیں کی۔البتہ نارنگ نمبر کی اشاعت کے بعد ان کے سرقوں کا ایک مجموعی تاثر جو نمایاں ہوا ہے تو اس اثر کو زائل کرنے کے لیے نارنگ صاحب کے بعض دوستوں نے ایک ہی وقت میں بیک وقت مجھے اور ارشد خالد کو نشانہ بنانے کی کاوش کی۔غیر ضروری اور غیر علمی شور شرابہ کی جو کاروائی کی گئی اور پھر جیسے یک دم خاموشی اختیار کر لی گئی،اس کی تفصیل بعد میں۔پہلے یہ وضاحت کر دوں کہ نارنگ صاحب کے سرقوں کے حوالہ سے ان کے سارے حامی آن ریکارڈ بھی اور آف دی ریکارڈ بھی دو تاثر دے کر ان کے سرقوں سے توجہ ہٹانے کا کام کر رہے ہیں۔**ایک تاثر یہ دیا جا رہا ہے کہ یہ قضیہ دراصل نارنگ وفاروقی جھگڑے ہی کا ایک حصہ ہے**۔یہ انتہائی گمراہ کن پروپیگنڈہ ہے۔نارنگ صاحب کی کتاب ''ساختیات،پسِ ساختیات اور مشرقی شعریات'' کے سرقوں کی نشان دہی کرنے والے پہلے مضمون سے لے کر چوتھے مضمون کی اشاعت تک (یہ چاروں مضامین نارنگ نمبر میں یکجا کر دیئے گئے ہیں)،فاروقی صاحب کہیں بھی نہیں ہیں۔اسے ایک نامناسب مفروضہ کے طور پر موضوع بنا لیا جائے کہ فاروقی صاحب اس میں کہیں موجود ہیں،تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا شمس الرحمٰن فاروقی صاحب نے نارنگ صاحب کو اکسایا تھا کہ وہ حالی کے بعد تھیوری کی دنیا میں انقلابی کردار ادا کرنے کے لیے اتنا بڑا علمی و ادبی ڈاکہ مار لیں۔ڈاکٹر نارنگ کی سرقوں کے معاملہ میں خاموشی ''مجرمانہ خاموشی'' بن چکی ہے۔اس میں شمس الرحمٰن فاروقی صاحب کا کہیں بھی کچھ لینا دینا نہیں تھا۔ہاں اب جب یہ

سارا کچھ سامنے آ گیا ہے تو اردو ادب کا ہر بہی خواہ اس میں دلچسپی تو بہر حال لے گا۔فاروقی صاحب سمیت سارے اہلِ علم کو اب کھل کر ان سرقوں پر اظہارِ خیال کرنا چاہیے۔

دوسرا تاثر یہ دیا جا رہا ہے کہ یہ دراصل مسلمانوں کی فرقہ پرستی ہے جو اردو کے ہندو ادیبوں کے خلاف محاذ بنا کر ہندو مسلم تنازعہ پیدا کر رہے ہیں۔قطع نظر اس سے کہ مجھ گنہگار کا معاملہ ویسے ہی یوں ہے کہ ؎

زاہدِ تنگ نظر نے مجھے کافر جانا
اور کافر یہ سمجھتا ہے مسلمان ہوں میں

میرے نزدیک صرف ادبی سچائی محترم ہے۔میں نام کی بجائے ادبی کام کی اہمیت کو مانتا ہوں۔اس معاملہ میں کسی کا کوئی بھی مذہبی عقیدہ ادبی سچائی کے اعتراف میں روک نہیں بن سکتا۔میں جوگندر پال جی کا نہ صرف معترف ہوں بلکہ ان کا ایک بڑا مداح ہوں۔میرے نزدیک جوگندر پال اردو فکشن کا بہت بڑا نام ہیں۔ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے انہیں متعدد بار نظر انداز کیا ہے لیکن اس کے باوجود جوگندر پال تخلیقی سطح پر اتنے بڑے ہیں کہ ان کے مقابلہ میں گوپی چند نارنگ صاحب کا نام لینا بھی مناسب نہیں ہے۔میں نے جدید ادب خانپور کا جوگندر پال نمبر سال ۱۹۸۵ء میں شائع کیا تھا۔سو میرے لیے کسی کا عقیدہ نہیں اس کا علمی و ادبی کام اہم ہے۔اسی طرح جب اردو ماہیے کی بحث میں چراغ حسن حسرتؔ کے مقابلہ میں ہمت رائے شرما جی کا نام سامنے آیا اور ٹھوس حقائق وشواہد دستیاب ہو گئے تو میں نے کسی جھجھک کے بغیر ۱۹۹۹ء میں اپنی کتاب ''اردو ماہیے کے بانی ہمت رائے شرما'' شائع کر دی۔چراغ حسن حسرت کے مقابلہ میں ہمت رائے شرما کو فوقیت دینے پر مجھے ایسی گالیاں سننا پڑیں کہ ماہیے کی یہ بحث کافروں کی سازش ہے۔لیکن میں نے ایسی بے ہودہ باتوں کی پرواہ نہیں کی۔میرے مضامین کا مجموعہ ''حاصلِ مطالعہ'' شائع ہوا تو اس میں ہمت رائے شرما اور جوگندر پال کے فن کی مختلف جہات پر میرے آٹھ مضامین شامل ہیں۔دیوندر اسر کے ایک ناولٹ اور ایک افسانوی مجموعہ پر میرے تاثرات شامل ہیں۔سو ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے سرقوں کے دفاع میں مجھ گنہگار کے سامنے ہندو مسلم والا مسئلہ بالکل بے

معنی ہے۔ یہ علمی زبان میں صرف اور صرف سارق اور اوریجنل کا مسئلہ ہے۔ جبکہ نارنگ صاحب
نے تو اتنا بڑا ڈاکہ مارا ہے کہ سارق کا لفظ بھی ان کے لیے چھوٹا پڑ گیا ہے۔

مجھے متعدد ہندو دوستوں کی طرف سے بھی ڈاکٹر نارنگ کے سرقوں کی نشاندہی پر توصیفی یا ہمت افزائی والی ای میلز مل رہی ہیں۔ خصوصاً انگریزی پریس میں اس کی کچھ روداد سامنے آنے کے بعد تو کئی ایسے ہندو دوست بھی رابطہ کر رہے ہیں جو اردو نہیں جانتے اور انگریزی میں یہ سب پڑھ کر حیران ہو رہے ہیں۔ ہندو دوستوں کی طرف سے ملنے والی پذیرائی کے ثبوت کے طور پر صرف آج یکم اگست ۲۰۰۹ء ہی کی تاریخ کو ملنے والی جگدیش پرکاش کی ای میل یہاں پیش کر رہا ہوں۔

jagdishpin@yahoo.com

Dear Mr. Qureshi,

Thanks for drawing attention to this thought provoking article by Prof.Naeem.

I never knew that an eminent Urdu scholar of the repute(??) of Dr. Narang should be indulging in this kind of reprehensible act of plagairism and getting an award for the same.

I remember a case when Mr.Narayanan, once an editor of daily " Hindustan Times" who lifted pasages from another author's artilces and published as his own was summarily dismissed from the editorship and has since receded into oblivion.

Knowledge is any one person's monopoly but if you rely on someone else's views of opinion, you must gracefully acknowledge it and never pass on as your own original work.

Jagdish Prakash

اس طرح کا ردِ عمل ظاہر کر رہا ہے کہ یہ خالصتاً علمی و ادبی سرقہ کا معاملہ ہے اور اس کا کسی، مذہب، کسی مسلک، کسی دھرم سے کوئی واسطہ نہیں۔ نارنگ صاحب کے احباب ان کی چوری کو چھپانے کے لیے فرقہ پرستی کی آڑ لینا چاہ رہے ہیں۔ جبکہ اپنی ''سرقہ پرستی'' کے تحفظ کے لیے فرقہ پرستی کا ''کارِ خیر'' بھی نارنگ صاحب کے حلقہ کی طرف سے ہی کیا گیا ہے۔ نصرت ظہیر

صاحب نے اپنے ''ادب ساز'' میں جو اخلاق اور تہذیب سے گری ہوئی زبان والا مضمون شائع کیا تھا، جس کے نتیجہ میں عکاس کا نارنگ نمبر اتنی جلد شائع کیا گیا۔ اس مضمون میں زبان کی غلاظت اور بے دلیل دفاع سے قطع نظر عمران شاہد بھنڈر کو احمدی قرار دینا بجائے خود ایک سفید جھوٹ اور مذہبی اشتعال انگیزی کے سوا کچھ نہیں تھا۔ اگر وہ احمدی ہوتے تب بھی نارنگ صاحب کے سرقوں کے دفاع کا یہ حربہ نہایت گھٹیا حربہ ہوتا۔ سو فرقہ پرستی کا طوق بھی اسی قبیلہ کی گردن میں موجود ہے۔

اب میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ ۲۶ رجون ۲۰۰۹ء سے لے کر ۲ جولائی ۲۰۰۹ء تک ایک خاص مہم کے طور عکاس کے مدیر ارشد خالد صاحب کو اور مجھے پورے تال میل کے ساتھ غیر ضروری باتوں میں الجھانے کی شرارت کی گئی اور مجھے اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ سب کچھ نارنگ صاحب کے اشارۂ ابرو پر کیا گیا۔ مجھے ای میل کے ذریعے کی گئی اپنی ساری خط و کتابت برادرم ارشد خالد نے فراہم کر دی ہے، تاہم انہوں نے ایک حد تک ان کے حوالے دینے کی اجازت دی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ خود اس ساری خط و کتابت کی روداد اور اپنا جواب عکاس میں شامل کرنا چاہتے ہیں۔ سو میں ان کی دی ہوئی حد کے مطابق یہاں ان ای میلز کا ذکر کروں گا۔ تاہم سب کا سیاق و سباق اور نفسِ مضمون مستحکم ہوگا اس کی میں مکمل ذمہ داری لیتا ہوں۔

۲۶ رجون کو ارشد خالد کو ای میل کے ذریعے لندن کے فارسی سے چوریاں کر کے نقاد بننے والے اور ''واہی تباہی'' بکنے کی شہرت رکھنے والے غلیظ شخص نے ایک ہندو عورت کے نام کی آئی ۔ڈی سے اپنا مضمون بھیجا۔ وہ میل نہیں کھلی۔ فائل دوبارہ بھیجی گئی۔ ۲۸ رجون کو نئی میل کی فائل کھلی تو ارشد خالد نے انہیں فوری طور پر یہ ای میل بھیجی۔

''مضمون مل گیا اور دیکھ بھی لیا۔ اس مضمون میں سے بعض زیادہ بے ہودہ حصے حذف کر کے اور عنوان بھی تبدیل کر کے اسے انڈیا میں ڈاکٹر نارنگ کے ایک دوست چھاپ چکے ہیں۔ کیا اس میں نارنگ پر سرقوں کے الزام کا رد کرنے کے لیے آپ نے کوئی ایک بھی دلیل یا ثبوت فراہم کیا ہے؟ میں جہالت کے فروغ میں آپ کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ سرقوں کے رد میں کوئی دلیل لائیے۔ گالیاں دینے اور بدزبانی کرنے سے سرقوں کا رد نہیں ہو جاتا۔ آپ نے نارنگ کا کیا دفاع

کرنا ہے۔ پہلے آپ ''پرواز'' لندن اپریل ۲۰۰۲ء میں چھپنے والے مضمون ''**ادب کے کھیپیے**'' کا علمی جواب لکھ کر اپنی صفائی دیں۔ میں وہ مضمون آپ کے جواب کے ساتھ چھاپ دوں گا۔ ورنہ ایک ہی بات ظاہر ہوتی ہے کہ نارنگ صاحب بھی چور اور ان کے سارے آپ جیسے ساتھی بھی چور۔ اور ہاں یہ آپ کے ای میل آئی ۔ ڈی میں آپ کے نام کی بجائے کسی ہندو عورت کے نام کا کیا مطلب ہے؟ ضرور بتائیے گا۔ آپ کا خیر خواہ **ارشد خالد**''

اس کا جواب اس فارسی چور نے اپنے نام سے نہیں دیا بلکہ اس ہندو عورت کی طرف سے ایک اوٹ پٹانگ سا خط بھیج دیا۔ اس معاملہ کی ساری تفصیل اور مزید دلچسپ حقائق ارشد خالد خود لکھنا چاہتے ہیں، اس لیے میں اپنی توجہ اصل موضوع تک ہی رکھتا ہوں۔ ارشد خالد کی ۲۸/جون ۲۰۰۹ء کی مذکورہ ای میل کے تین دن بعد یکا یک انہیں ستیہ پال آنند صاحب کی جانب سے ایک حیران کن ای میل ملی ۔ یہ ساری الیکٹرانک خط و کتابت صرف ایک ہندو خاتون کی آئی ڈی کی آڑ میں لندن کے چور نقاد اور ارشد خالد کے درمیان تھی۔ ستیہ پال آنند تین دن کے بعد کیسے اس معاملہ میں آ ٹپکے۔ قارئین خود اندازہ کر سکتے ہیں۔ لندن کے ''واہی تباہی'' بکنے والے چور نقاد کے کہنے پر وہ کبھی اتنی بڑی حماقت نہیں کر سکتے تھے۔ لازمی طور پر ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے ان سے ذاتی طور پر اس معاملہ میں دخل دینے کے لیے کہا اور وہ نارنگ کی محبت میں اس غلطی کا ارتکاب کر بیٹھے۔

ستیہ پال آنند صاحب کی پہلی ای میل کے جواب میں ارشد خالد صاحب نے انہیں لکھا کہ میں لندن کے چور نقاد کی ساری مراسلت کے ساتھ آپ کا خط بھی عکاس کے اگلے شمارہ میں شامل کر رہا ہوں۔ اس پر یکم جولائی کو ارشد خالد کے نام ستیہ پال آنند صاحب کی ای میل آ گئی۔

''مجھے کچھ وقت دیں بھائی جان! کہ میں اس معاملے کی تہہ تک پہنچ سکوں۔ جلد بازی کرتے ہوئے میرا مراسلہ اور اپنا جواب شامل اشاعت نہ کریں۔ میری رائے اگر آپ کو پسند آئے تو آپ مجھے صرف دو سطریں لکھ دیں۔ مجھے آپ سے کوئی خدا واسطے کا بیر نہیں ہے۔ میں نے آج تک خود کو ان بکھیڑوں سے دور رکھا ہے۔ اور اب بھی رکھنا چاہتا ہوں۔ مجھے اپنے دشمنوں میں شمار

نہ کریں۔ آپ کا خیر اندیش **ستیہ پال آنند**۔''

دو دن کے انتظار کے بعد تین جولائی کو ارشد خالد صاحب نے ستیہ پال آنند صاحب کو پھر توجہ دلائی اور لکھا:

''آنند صاحب! امید ہے اب تک معاملہ کی تہہ تک پہنچ گئے ہوں گے۔ آپ کی ای میل کا منتظر ہوں۔ ایک ان پیج فائل اور ایک اخبار کا تراشہ اٹیچ ہے۔ **ارشد خالد**''

اس کے جواب میں تین جولائی کو ہی ستیہ پال آنند صاحب کی جانب سے یہ جوابی ای میل آئی۔

Bhai jaan: aadab. This is only in my personal context please. I have no quarrel with you. So, let's forget and forgive. Nothing is to appear in press. 79 years old that I am, I have always been an uncontroversial literary figure and want to remain so, a friend to all, till my last breath. **Satyapal Anand**

حقیقت یہ ہے کہ ستیہ پال آنند صاحب ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے سرقوں کے انکشاف کی حقیقت کو بخوبی سمجھتے ہیں۔ لیکن کہیں کہیں نارنگ صاحب کی محبت میں کچھ out of the way کر بیٹھے ہیں۔ یہاں ستیہ پال آنند صاحب کے میرے نام لکھے گئے ۳۰/جنوری ۲۰۰۹ء کے ایک برقی مکتوب (ای میل کے لیے برقی مکتوب کے الفاظ سے کام چلایا جا سکتا ہے) میں نارنگ صاحب کا ذکر خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ ان کے ایک مضمون میں حیرت گورکھپوری کے جدید ادب کا ذکر تھا، میرے استفسار پر انہوں نے لکھا:

''بھائی جان! آداب   جلدی میں یہ ای میل بھیج رہا ہوں۔ ابھی میرے بیٹے نے مجھے ہسپتال لے جانا ہے۔ Radiation therapy والی جگہ پر کچھ complication ہوگئی ہے۔ شاید ہاسپٹل داخل ہونا پڑے۔ میرے پاس ایک ڈائری ہوتی ہے، جس میں کسی بھی مضمون کے مندرجات کے بارے میں اپنے نوٹس اور حوالہ جات (references) اور کتابیات (bibliography) لکھ لیتا ہوں۔ میں نے حیرت گورکھپوری کا جدید ادب تو دیکھا نہیں، لیکن میری ڈائری میں اس کا حوالہ موجود ہے۔ یہ دو ماہی تھا اور باقاعدگی سے کچھ برس چھپتا رہا۔ شوکت مرحوم نے اس میں ۱۳-۱۴ ماہ تک نوکری کی۔ جو جملہ میں نے آپ کو ای میل میں لکھا تھا وہ آپ کے جدید ادب کی تعریف میں تھا کہ میں تو کسی اور جدید ادب کو نہیں جانتا۔ حیرت گورکھپوری کے حوالے سے نہیں تھا۔ ہم لوگ جو

انگریزی کے پروفیسر ہیں اور تنقید کے علاوہ تحقیق بھی کرتے ہیں،اس معاملے میں بے حد محتاط
رہتے ہیں کہ کہیں کوئی "referential mistake" نہ ہو جائے۔میں تو ۲۵ برسوں سے مغرب کی
جامعات میں پڑھا رہا ہوں۔ **میں نارنگ صاحب جیسی غلطی نہیں کرسکتا**۔اطمینان رکھیں۔اللہ آپ
کوخوش رکھے۔ **ستیہ پال آنند**‘

نارنگ صاحب جیسی غلطی سے بچنے والے ستیہ پال آنند جی کے اس مکتوب سے قطع نظر
۲۶ جون سے ۳ جولائی تک ہونے والی اس ساری ڈرامہ بازی کے پہلو بہ پہلو اسی دورانیہ کے اندر
ایک اور ڈرامہ میرے بہت ہی عزیز دوست نصرت ظہیر صاحب نے اوپن ای میل کی صورت میں
دہلی سے شروع کر رکھا تھا۔ان کی یہ اوپن ای میلز میرے نام تھیں۔ان کے ساتھ ہونے والی
مراسلت کو مکالمہ کی صورت میں محفوظ کر رہا ہوں۔نصرت ظہیر صاحب نے پہلی ای میل ۲۹ر جون
۲۰۰۹ء کو جاری کی اور چوتھی و آخری ای میل ۲ر جولائی ۲۰۰۹ء کو رات نو بج کر بارہ منٹ پر جاری
کی۔اس ای میل میں انہوں نے مزید مکالمہ جاری رکھنے سے انکار کر دیا اور وجہ اپنی اہم مصروفیات
بتائیں۔برادرم نصرت ظہیر صاحب کی اوپن ای میلز کا بنیادی نکتہ یہ تھا کہ عکاس کے نارنگ نمبر میں
نصرت ظہیر صاحب کا جو اقتباس دیا گیا ہے وہ سیاق و سباق سے الگ کر کے پیش کیا گیا ہے جو
جعلسازی ہے۔اور جعلسازی تو سرقہ سے بھی بڑا جرم ہے۔میں نے اپنی جوابی ای میلز میں ان کا
اقتباس پوری طرح روشن کر کے پیش کیا اور بار بار انہیں کہا کہ وہ اصل سیاق و سباق پیش کر کے
جعلسازی کو واضح کریں لیکن وہ آخر دَم تک ایسا نہیں کر سکے۔پھر وہ بحث کو کئی دوسرے موضوعات
میں الجھانے کی تگ و دو کرتے رہے لیکن میں نے انہیں صرف ان کے اقتباس کے اصل سیاق و
سباق اور نارنگ صاحب کے سرقوں کے نکات تک ہی محدود رکھا۔البتہ اب سوچ رہا ہوں کہ
برادرم نصرت ظہیر نے سرقہ سے بھی بڑا جرم جعل سازی کو قرار دیا ہے تو عجیب بات ہے کہ مغربی دنیا
میں نارنگ صاحب کے اعزاز میں تقریبات کرانے والے بیشتر لوگ (بہ استثنائے چند بیشتر لوگ
)حقیقتاً یا سارق ہیں یا جعلی شاعر بنے ہوئے ہیں۔جرمنی،انگلینڈ اور امریکہ کے ایسے سارقوں یا
جعلی شاعروں کے بارے میں پہلے سے آن ریکارڈ مواد موجود ہے۔تو جناب نارنگ صاحب کا اپنا

کام ہی سرقہ اور جعلسازی پر استوار نہیں بلکہ ان کے مغربی دنیا کے ہم نوالہ و ہم پیالہ بھی زیادہ تر
سارق و جعلی لوگ ہیں۔کند ہم جنس با ہم جنس پرواز۔کسی ادبی رسالہ کو ان حقائق کی ضرورت ہو
تو پہلے سے چھپا ہوا سارا میٹر انہیں فراہم کر سکتا ہوں۔خیر یہ ایک متعلقہ لیکن دوسرا موضوع
ہے۔بات ہو رہی تھی کہ نصرت ظہیر صاحب نے ۲ر جولائی کو چوتھی ای میل کے ساتھ بحث ختم کر
دی۔بظاہر انہوں نے اپنی مصروفیات کا جواز پیش کیا لیکن ادھر برادرم سعید شباب کی ایک ای میل
نے اس ساری مہم جوئی کا ایک اور ہی منظر پیش کر دیا۔۲ر جولائی ۲۰۰۹ء کو صبح ۹ بج کر تین منٹ پر
سعید شباب صاحب نے ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کو یہ ای میل بہ عنوان ’’مزید غور فرمائیے‘‘ بھیجی تھی۔

’’محترمی جناب ڈاکٹر نارنگ صاحب   آداب

دیکھیے آپ کی حمایت کے نام پر آپ کے دوست آپ کو کس طرح مزید تماشہ بنوا رہے
ہیں۔میں نے اپنے طور پر تصدیق کی ہے کہ عکاس کا ڈاکٹر نارنگ نمبر صرف اس وجہ سے چھپا ہے
کہ نصرت ظہیر نے کسی طباطبائی کا کوئی بے ہودہ مضمون شائع کیا تھا۔وہ مضمون آپ کو سپورٹ
کرنے والا تھا یا damage کرنے والا؟ اچھی طرح سے سوچیے۔بالکل اسی طرح اب نصرت ظہیر
صاحب جس طرح اپنی صفائی دینے نکلے اور آپ کا دفاع کرنا شروع کیا،اس میں ان کے ساتھ جو
ہو رہا ہے سو ہو رہا ہے لیکن اصل تماشہ تو آپ کا لگ رہا ہے۔آپ اس صورتحال پر خوش ہیں تو ٹھیک
ہے ورنہ اپنے نادان دوستوں سے بچیے۔نصرت ظہیر صاحب کی موجودہ کاروائی کے نتیجہ میں اب
’’مشرقی شعریات‘‘ پر تحقیق کا کام بھی شروع ہو گیا ہے۔اور اس کی جتنی معلومات ابھی تک مل سکی
ہے،خاصی افسوسناک ہے۔کوئی ٹھوس بات میرے علم میں آئی تو اس کا اشارہ ضرور آپ کو دوں
گا۔لیکن بہرحال آپ کے بے ہودہ حمایتیوں نے اب آپ کو ’’مشرقی شعریات‘‘ کے حوالے سے
بھی تماشہ بنوا دینا ہے۔اس صورتحال پر رنجیدہ ہوں۔

آپ کا مداح **سعید شباب**‘

اس دوران بات صرف مشرقی شعریات تک نہیں رہی،لسانیات پر نارنگ صاحب کا
سارا کام بھی ’’ساختیات،پسِ ساختیات اور مشرقی شعریات‘‘ جیسا ہی نکل آیا ہے۔وہاں بھی ان

کے سرقہ کا طریقۂ واردات وہی ہے جو ساختیات والی شاہکار ''تصنیف'' کا رہا ہے۔اس سلسلہ میں مزید کچھ کہنا مناسب نہیں ہے، جب وہ سرقے بےنقاب ہوں گے تو اردو دنیا خود دیکھ لے گی۔

سعید شباب کے مذکورہ بالا ۲؍جولائی کے ارسال کردہ برقی مکتوب سے ظاہر ہو رہا ہے کہ انہوں نے صبح ۹ بجے کے لگ بھگ نارنگ صاحب کو ان کے حمایتیوں کی سرگرمیوں کے نتائج سے آگاہ کیا اور اسی روز رات کو نو بجے کے لگ بھگ نصرت ظہیر صاحب کی مصروفیات یکا یک بڑھ گئیں اور وہ اپنی چھیڑی ہوئی بحث سے الگ ہو گئے۔اور اگلے روز جواب مانگنے پر ستیہ پال آنند صاحب بھی معذرت کر گئے۔

میرا ذاتی خیال ہے کہ یہ سارا شور شرابہ نارنگ صاحب کے کہنے پر تین اطراف انگلینڈ، دہلی اور امریکہ سے شروع کرایا گیا اور تینوں اطراف میں علمی سبکی کے بعد سعید شباب کے مکتوب کو ملحوظ رکھتے ہوئے اسے یکدم بند کرا دیا گیا۔تاہم ہو سکتا ہے یہ سب اتفاقاً ایک ساتھ شروع ہو گیا ہو اور نارنگ صاحب کا اس میں کچھ عمل دخل نہ ہو۔

میں نے جملہ شواہد پیش کر دیئے ہیں کسی بہتر نتیجہ تک پہنچنے کے لیے قارئین ادب اپنے اپنے ذہن سے کام لے سکتے ہیں۔

(مطبوعہ روزنامہ **ہمارا مقصد** دہلی۔دو قسطوں میں ۶؍اگست ۲۰۰۹ء، ۷؍اگست ۲۰۰۹ء)

نارنگ صاحب کے ایک نئے الزام کا جواب

جب سے ڈاکٹر گوپی چند نارنگ صاحب کی کتاب ''ساختیات، پسِ ساختیات اور مشرقی شعریات'' کے سرقے بےنقاب ہوئے ہیں تب سے نارنگ صاحب نے مختلف حیلوں بہانوں سے ایسے جواب دلانے کی کوشش تو کی ہے کہ بحث کا رُخ اُن کے سرقوں سے ہٹ کر کسی اور طرف چلا جائے لیکن اصل مسئلہ یعنی اپنے سرقوں کے بارے میں نہ وہ خود کوئی صفائی دے رہے ہیں اور نہ ہی ان کا کوئی دفاع کرنے والا اس حوالے سے کوئی ایک بھی علمی دلیل دے سکا ہے۔میں اپنے مضمون ''اتفاقیہ یا منصوبہ بند کارروائی؟'' میں دو الزامات کا مدلل رد کر چکا ہوں۔ان میں سے ایک الزام سرقہ کے معاملہ کو نارنگ وفاروقی اختلاف کے تناظر میں پیش کرنے کی سعیِ نامشکور ہے تو دوسرا الزام اردو کے ہندو ادیبوں کے ساتھ امتیازی سلوک کا گلہ کرتے ہوئے اسے فرقہ پرستانہ رویہ قرار دینے کی کاوش تھی۔ان دونوں الزامات کا رد اپنے مذکورہ بالا مضمون میں کر چکا ہوں۔

اب ایک نئے الزام کے حوالے سے چند گزارشات کرنا چاہتا ہوں۔کینیڈا کے منیر سامی صاحب نے ایک اخباری تراشہ بھیجا تو معلوم ہوا کہ مجھ پر الزام عائد کیا گیا ہے کہ مجھے ڈاکٹر نارنگ صاحب نے سجاد ظہیر صدی کی تقریب کے سلسلہ میں دہلی میں مدعو کیا تھا۔میں نے ائر ٹکٹ کا مطالبہ کیا۔یہ مطالبہ پورا نہیں کیا گیا تو میں نارنگ صاحب کا مخالف ہو گیا۔اسی وجہ سے ان سرقوں کا چرچا کیا جا رہا ہے۔

پہلے تو ایک بڑی ہی اصولی اور سیدھی سی بات ہے کہ ایک شخص مالِ مسروقہ سمیت رنگے ہاتھوں پکڑا جائے تو وہ سیدھے صاف لفظ میں چور ہے۔اگر وہ اپنی چوری کو ماننے اور اس پر شرمندہ ہونے کی بجائے اپنے حمایتیوں کے ذریعے یہ کہنا شروع کر دے کہ چونکہ اسے پکڑنے والے اس کے مخالف ہیں اس لیے الزام غلط ہے اور یہ مال میرا ہی ہے۔چونکہ میرا مذہب دوسرا ہے اس لیے

یہ الزام غلط ہے۔ نارنگ صاحب کو یہ سارے پاپڑ اس لیے بیلنے پڑ رہے ہیں کہ وہ اپنی چوریوں کا سامنا کر کے اس پر ندامت کا اظہار کرنے کی بجائے اپنی پبلک ریلشنگ کے بَل پر انہیں بزور بازو اپنا مال ثابت کرنا چاہ رہے ہیں، جو اَب تو بالکل ہی ممکن نہیں رہا۔

اب آتے ہیں نارنگ صاحب کی طرف سے لگائے گئے ائرٹکٹ والے الزام کی طرف۔ انہوں سجاد ظہیر صدی کے حوالے سے مجھے مدعو نہیں کیا تھا۔ اس حوالے سے مجھے سجاد ظہیر صاحب کی صاحبزادی نور ظہیر نے مدعو کیا۔ البتہ نارنگ صاحب نے ساہتیہ اکیڈمی کے نئی بستیوں والے سیمینار میں مدعو کیا تھا۔ میں نے پہلے مرحلہ میں ہی معذرت کر لی کہ میں کہیں بھی جانے کے لیے ائرٹکٹ افورڈ نہیں کر سکتا۔ اس سلسلہ میں نارنگ صاحب کی طرف سے لگوائے جانے والے اس بے ہودہ الزام سے پہلے کی ایک تحریر میں اس کا رد موجود ہے۔ جدید ادب کے شمارہ نمبر ۱۲ (جنوری تا جون ۲۰۰۹ء) میں مطبوعہ اپنی یادوں کے باب ''چند نئی اور پرانی یادیں'' کا ایک اقتباس پیش ہے۔ اس سے صرف نارنگ صاحب کی کانفرنس ہی نہیں اس انداز کی دوسری تقریبات کے بارے میں بھی میرے طرزِ عمل کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

''میں نے مشاعرہ بازی سے پرہیز کی اپنی مجبوریاں بتائیں۔ پھر باتوں کا سلسلہ چل نکلا تو میں نے وضاحت کی کہ بھائی! ان مشاعروں سے اردو کی جو بین الاقوامیت بنی ہے سو بنی ہے، مجھے تو اب عالمی کانفرنسوں اور سیمینارز کے حقیقی نتائج پر بہت سے تحفظات ہیں۔ نشستند، خوردند، برخاستند سے زیادہ کوئی نتیجہ سامنے آیا ہو تو بتایا جائے۔ پھر مجھے وہ کانفرنسیں اور سیمینارز یاد آنے لگے جن میں مجھے مدعو کیا گیا لیکن میں نے شرکت سے معذرت کر لی۔ سجاد ظہیر صدی کی تقریبات کے حوالے سے ان کی صاحبزادی نور ظہیر نے بذاتِ خود مدعو کیا، ڈاکٹر خلیق انجم نے انجمن ترقی اردو ہند کی صد سالہ تقریب کے ضمن میں مدعو کیا، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے ساہتیہ اکادمی کے زیر اہتمام اردو کی نئی بستیاں کے موضوع پر ہونے والے سیمینار میں مدعو کیا، ڈاکٹر خلیل طوق اَر نے استنبول یونیورسٹی کے سیمینار میں مدعو کیا، لندن کی میلینئم کانفرنس کے منتظمین نے اس کانفرنس کے بعد کی کانفرنس میں مدعو کیا۔۔۔ میں نے ان سب سے معذرت کی تھی۔ وجہ؟۔۔۔

تمام دعوت ناموں میں قیام وطعام وغیرہ امور کی ذمہ داری لی جاتی تھی لیکن ہوائی جہاز کا ٹکٹ ''بین الاقوامی ادیبوں'' کو اپنی جیب سے خریدنا تھا۔ میں چونکہ ہوائی جہاز کا ٹکٹ خریدنے کی استطاعت نہیں رکھتا اس لیے ادب کے ساتھ شرکت سے معذرت کر لیتا ہوں۔ اور اس لیے قلبِ یورپ میں بیٹھ کر بھی پورے کا پورا مقامی شاعر اور ادیب ہوں اور اس بات پر خوش ہوں کہ میں معروف معنوں میں ''بین الاقوامی ادیب'' نہیں ہوں۔'' (جدید ادب شمارہ ۱۲۔ صفحہ نمبر ۲۳۴)

یہاں یہ بھی وضاحت کر دوں کہ سال ۲۰۰۳ء میں جب ماریشس کی اردو کانفرنس کے سلسلہ میں مدعو کیا گیا تھا تو شروع میں ایک طرف کا کرایہ دینے کا ذکر کیا گیا تو میں نے پہلے مرحلہ میں ہی شرکت سے معذرت کر لی۔ بعد میں ان لوگوں نے خود رابطہ کیا اور کہا کہ ہم آپ کو ٹکٹ بھیج رہے ہیں۔ سو اگر کوئی مجھے مدعو کرتا ہے تو میں اپنی مجبوری مہذب انداز میں بتا دیتا ہوں۔ میں مذکورہ بالا ساری تقریبات میں شریک نہیں ہوا تو اس وجہ سے میری کسی سے بھی ناراضی نہیں ہے۔ جب میں نے شرکت سے معذرت کر لی تب نارنگ صاحب نے کہا کہ چلیں آپ اپنا مضمون بھیج دیں۔ میں نے مضمون بھیج دیا۔ تقریب ہو گئی۔

ناراضی ہرگز نہیں تھی لیکن یہ افسوس ضرور تھا کہ نارنگ صاحب اردو کی نئی بستیوں کے نام پر زیادہ تر جعلی شاعروں اور چور قسم کے ادیبوں کو اہمیت دے رہے تھے۔ اس کے بعد نارنگ صاحب نے سات جون ۲۰۰۵ء کو بذریعہ ای میل فرمائش کی کہ میں انہیں دو مضامین فراہم کر دوں۔ ایک میرے فن پر مغرب کے کسی اچھے ادیب کا مضمون۔ دوسرا کسی مغربی ملک میں مقیم اردو ادیب کے فن پر میرا مضمون۔ یہ بڑی عمدہ پیش کش تھی۔ مجھے اپنی پبلک ریلشنگ مستحکم کرنی چاہیے تھی۔ لیکن میں نے بڑی صاف گوئی سے نارنگ صاحب کو اردو کی نئی بستیوں کی حقیقت سے آگاہ کیا۔ تب ایک دن میں میری نارنگ صاحب کے ساتھ ای میل کے ذریعے جو مراسلت ہوئی تھی وہ بھی میں نے شائع کر دی تھی۔ دو ماہی گلبن لکھنو کے شمارہ جولائی، اگست ۲۰۰۵ء میں میرے مطبوعہ خط کا یہ اقتباس ساری صورتحال کو واضح کر دیتا ہے۔

'' مارچ ۲۰۰۵ء میں ساہتیہ اکیڈمی کی جانب سے، دراصل ڈاکٹر گوپی چند نارنگ صاحب

کی جانب سے اردو کی بستیوں پر خصوصی سیمینار کرایا گیا۔اس میں نہ صرف کئی جعلی لوگ شریک ہوئے، بلکہ کئی جعلی لوگوں پر خصوصی مقالات لکھوائے گئے(اردو کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے)۔میں نے بوجوہ اس تقریب میں شمولیت سے معذرت کر لی تھی،البتہ نارنگ صاحب کی فرمائش پر اپنا مضمون لکھ کر بھیج دیا تھا۔اب حال ہی میں میری ان سے ای میل کے ذریعے کچھ بات چیت ہوئی تو میں نے انہیں بتایا کہ یہاں تو اسی فی صد شاعر اور ادیب جعلی ہیں۔(باقی بیس فی صد میں بھی کتنے ہیں جو جینوئن لکھنے والے ہیں اور کتنے ہیں جو بھرتی کے لکھنے والے ہیں،وہ ایک الگ موضوع ہے۔)یہاں مورخہ ۷رجون ۲۰۰۵ کو یعنی ایک ہی دن میں ہونے والی ہماری برقی خط و کتابت کا متعلقہ حصہ قارئین کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔میں نے اپنی ای میل میں لکھا:

''میں اردو کی نئی بستیوں کا قائل نہیں ہوں،یہ صرف جعلسازی کے گڑھ ہیں۔یہاں دولت کے بَل پر 80% جعلی لوگ شاعر اور ادیب بنے ہوئے ہیں۔یہ صورتحال اردو کے لیے تباہ کن ثابت ہو گی اور بعض لوگ شاید یہی چاہتے ہیں''.............اس کے جواب میں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے مجھے لکھا:

AZIZ-E-MAN ! I AGREE WITH YOU ENTIRELY THAT MOST OF THE PEOPLE CLAIMING TO BE WRITERS ARE NOT WRITERS AND ONLY 20% ARE GENUINE WRITERS. THAT EXACTLY IS WHAT I MEAN TO HAVE SOME ARTICLES ON THOSE GENUINE WRITERS.

یہ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کی اعلیٰ ظرفی ہے کہ انہوں نے میری بات سے اتفاق کیا،ان کی اس ای میل کے جواب میں اسی تاریخ کو میں نے پھر انہیں لکھا:

''آپ کے سیمینار میں باہر سے شامل ہونے والوں میں سے،یا جن پر مقالے لکھوائے گئے تھے کئی لوگ یا تو جینوئن لکھنے والے نہ تھے یا ان کی چوری اور جعلسازی کھلی ہوئی حقیقت تھی''

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کا حوالہ اس لیے دے رہا ہوں کہ وہ خود اکثر بیرون ممالک کے ادبی دوروں پر جاتے رہتے ہیں اور اسی حوالے سے سیمینار بھی کرا چکے ہیں اور کسی بھی پاکستانی یا ہندوستانی ادیب سے کہیں زیادہ وہ ان ''بستیوں'' کی اصل ادبی اور علمی حقیقت جانتے ہیں۔سوان

کا ماننا کہ ان بستیوں میں صرف بیس فی صد جینوئن لوگ ہیں،سند کا درجہ رکھتا ہے۔''

اسی خط کے تناظر میں میرا ایک اور خط گلبن لکھنؤ کے شمارہ جنوری تا اپریل ۲۰۰۷ء میں شائع ہوا۔اس کا اقتباس بھی پیش کیے دیتا ہوں۔

''چونکہ نارنگ صاحب کے ساتھ بہت سارے ادیبوں کی مجبوریاں یا مفادات وابستہ ہیں اور ایسے دوست عجلت میں کچھ بھی لکھ جاتے ہیں اس لئے احتیاطاً وضاحت کر رہا ہوں کہ گلبن کے شمارہ جولائی،اگست ۲۰۰۵ء میں میرا ایک تفصیلی خط چھپا ہوا ہے جس میں،میں نے نارنگ صاحب سے کہا تھا کہ بیرون ملک ۸۰ فی صد جعلی اور غیر جینوئن لوگ شاعر اور ادیب بنے ہوئے ہیں اور یہ کہ جعلی لوگوں کو پروجیکٹ نہیں کرنا چاہئے۔نارنگ صاحب نے میری بات سے اتفاق کیا تھا(تفصیل مذکورہ شمارہ میں دیکھی جا سکتی ہے)،اب بتا رہا ہوں کہ یہ درحقیقت نارنگ صاحب کی اس ای میل کا جواب تھا جس میں انہوں نے مجھ سے دو تقاضے فرمائے تھے۔ایک یہ کہ میں کسی اچھے ادیب کا اپنے بارے میں کوئی اچھا سا مضمون انہیں فراہم کر دوں،دوسرا یہ کہ میں کسی جینوئن ادیب پر خود ایک مضمون لکھ کر انہیں بھیجوں جنہیں وہ اپنی آنے والی کتاب ''اردو کی نئی بستیاں'' میں شامل کرنا چاہتے تھے۔(ان کی اصل ای میل میرے پاس محفوظ ہے)۔مجھے اندازہ تھا کہ وہ ایسا اس لئے کر رہے ہیں کہ ان کی بیرون ملک بستیوں والے سیمینار میں جو فاش خامیاں رہ گئی تھیں انہیں کور کر لیا جائے۔بلکہ گدھوں کے ساتھ چند گھوڑے باندھ کر گدھوں،گھوڑوں کو برابر کر دیا جائے۔اس لئے اُس تقاضہ کے باوجود جس پر بلا چون و چرا عمل کر کے میں ان کی نئی کتاب ''اردو کی نئی بستیاں'' میں جگہ پا سکتا تھا،میں نے اس مفاد کو اہمیت نہیں دی اور نارنگ صاحب کو اصل حقیقت سے آگاہ کیا(ویسے وہ خود بھی اصل حقیقت سے بخوبی آگاہ ہیں،پھر بھی۔۔۔)

سرِ دست اتنی وضاحت کافی ہے،باقی پھر سہی۔امید ہے اس وضاحت کو مدِ نظر رکھا جائے گا۔''

اس سارے منظر نامہ کے بعد اگر کوئی میرے مزاج کو سمجھ سکتا ہے تو وہ بخوبی اندازہ کر سکتا ہے کہ میرا اگر کوئی اختلاف تھا تو وہ جعلی شاعروں یا چور ادیبوں کی پروجیکشن سے متعلق تھا۔اس کا مناسب اظہار بھی میں نے تب کیا جب ان کی طرف سے دو مضامین کا تقاضہ کیا گیا۔ائرٹکٹ کا

مسئلہ تو ناراضی کے تناظر میں کہیں بھی نہیں ہے۔نہ نور ظہیر کے ساتھ، نہ خلیق انجم کے ساتھ، نہ ڈاکٹر نارنگ کے ساتھ نہ استنبول یونیورسٹی کے خلیل طوق اُر کے ساتھ۔ بلکہ میں چیلنج کرتا ہوں کہ کوئی بھی شخص یہ بتا دے کہ جرمنی میں قیام کے سترہ برسوں کے دوران میں نے کبھی کسی ذریعے سے کسی کانفرنس میں شرکت کے لیے کسی سے فرمائش کی ہو یا شمولیت کے لیے کوئی بھاگ دوڑ کی ہو۔خدا نے اس معاملہ میں بڑی ہی بے نیازی بخش رکھی ہے۔اور اس نعمت کے بخشے جانے پر خدا کا بڑا ہی شکر گزار ہوں۔

ساختیات، پسِ ساختیات کے حوالے سے نارنگ صاحب کے ساتھ اختلاف ۱۹۹۴ء سے آن ریکارڈ چلا آ رہا ہے۔سہ ماہی دستک ہوڑہ، مغربی بنگال کے شمارہ جولائی ۱۹۹۴ء میں میرا ایک خط چھپا ہوا موجود ہے۔اس میں نارنگ صاحب کے ایک مضمون پر میں نے اپنی سوجھ بوجھ کے مطابق تفصیلی اظہارِ خیال کیا ہے اور ان کے پیش کردہ نکات کو ''گمراہ کن'' قرار دیا ہے۔حالانکہ تب ان کے یہ افسوسناک سرقے بھی سامنے نہیں آئے تھے۔اس خط کو کسی مضمون کا حصہ بنا کر یا پھر ویسے ہی اپنے مضامین کے نئے مجموعہ میں شامل کر لوں گا۔

ڈاکٹر نارنگ صاحب کی اردو کے لیے بے پناہ خدمات ہوں گی۔وہ بڑی عظیم شخصیت ہوں گے۔لیکن موضوع زیرِ بحث یہ ہے کہ انہوں نے اپنی ''تصنیف'' ''ساختیات، پسِ ساختیات اور مشرقی شعریات'' میں مغربی کتابوں سے بے شمار سرقے کیے ہیں یا نہیں؟ اگر کیے ہیں تو ان کی ''بے پناہ خدمات'' اور ''شخصیت کی عظمت'' کے باعث ان کے سرقوں کا جرم کئی گنا زیادہ شرمناک ہو جاتا ہے۔کیا ان کی عظمت کے دلدادگان میں سے کوئی ایک مائی کا لال ایسا ہے جو پہلے سرقوں کی نشاندہی کرنے والے سارے مضامین کو بغور پڑھے، پھر اصل انگریزی کتابوں سے ان الزامات کو جانچے اور اس کے بعد کھل کر اصل حقیقت بیان کر دے؟۔۔۔افسوس یہ ہے کہ انہوں نے جن ادبی فضلاء کی حمایت پر تکیہ کر رکھا ہے، ان کے ساتھ دو بدو بات کی جائے تو ان میں سے ایک بھی ایسا نہیں ہے جو زیرِ بحث کتاب کے بارے میں پانچ منٹ تک بھی گفتگو کرنے کے قابل نکلے۔سو نارنگ صاحب کو یقین کر لینا چاہیے کہ اپنی بے شمار خدمات گنوا کر بھی وہ چوری کے

الزام سے بری نہیں ہو سکتے اور متعدد دوسرے مسائل کو چھیڑ کر گفتگو کا رُخ کسی اور طرف پھیر دینے سے بھی ان کی سرقوں کے جرم سے نجات ممکن نہیں ہے۔جدید ادب کے شمارہ نمبر ۱۲ پر انہوں نے جس طرح سنسر شپ کا دباؤ ڈالا تھا، اس کی پوری روداد چھپ چکی ہے اور نارنگ صاحب کو اپنی اس حرکت کی داد بھی مل چکی ہے۔تاہم میں نے اس اشو کو بھی ایک حد تک ہی رکھا ہے۔اصل اشو تو یہ ہے کہ انہوں نے بڑے پیمانے پر سرقے کیے ہیں یا نہیں؟ اگر وہ ندامت کے ساتھ معذرت کر لیں تو انہیں ان کی زیرِ بحث ''تصنیف'' کا مترجم مانا جا سکتا ہے۔ورنہ موجودہ صورت حال میں وہ مترجم بھی نہیں ہیں، انہوں نے اس صدی کا سب سے بڑا علمی ڈاکہ مارا ہے۔

جدید ادب کے شمارہ نمبر ۱۲ پر تبصرہ کرتے ہوئے پروفیسر ڈاکٹر ظہور احمد اعوان صاحب نے روزنامہ آج پشاور کی اشاعت یکم جنوری ۲۰۰۹ء میں اپنا پورا کالم لکھا تھا۔اس میں میرا ذکر بہت زیادہ محبت کے ساتھ کیا گیا تھا۔میں نے شمارہ نمبر ۱۳ میں اس کالم کا بمشکل پانچواں حصہ شائع کیا ہے۔چار حصے شامل نہیں کیے۔جو حصہ شامل نہیں کیا اس میں ایک جملہ یہ بھی ہے: **''حیدر قریشی شیر کی کچھار میں جا کر اس کو للکارتے ہیں''**۔میں نے اس جملہ کو جدید ادب شمارہ ۱۳ میں شائع نہیں کیا لیکن اس کا مزہ ضرور لیا۔ڈاکٹر نارنگ صاحب کے سرقوں کو نمایاں کرنے میں مجھ سے جو کام ہوا ہے اُسے میں خدا کی طرف سے بخشی گئی خاص توفیق شمار کرتا ہوں۔افسوس کہ نارنگ صاحب شیر بن کر سامنے آنے کی بجائے لندن کی ایسی ''چیز'' کو میرے پیچھے لگانے میں جتے ہیں جس کو میں نے کبھی جواب نہیں دیا۔اور جو ادبی دنیا کی واحد ''چیز'' ہے جس نے اپنی کتاب مجھے پریزنٹ کر کے بھیجی تو میں نے اسے اس کی رسید دینا بھی گوارا نہیں کیا۔کیونکہ میں اس کے ادب کے نام پر غلیظ کردار سے شروع سے ہی متنفر ہوں۔میں نارنگ صاحب ہی سے گزارش کروں گا کہ ادھر اُدھر سے بے تکے اعتراضات کرانے کی بجائے اب شیر بنیں اور اپنے سرقوں کا سامنا کرتے ہوئے خود اس حوالے سے بات کریں کہ بے تکی الزام تراشیاں اور موضوع کا رخ پھیرنے والی کاوشیں انہیں ان کے سرقوں کے جرم سے بری نہیں کر سکتیں۔

(مطبوعہ روزنامہ **ہمارا مقصد** دہلی۔۱۰؍اگست ۲۰۰۹ء)

ڈاکٹر نارنگ کے حامی منیر پرویز سامی
کے ایک اعتراض کا جواب

(کینیڈا کے ایک صحافی منیر پرویز سامی نے ڈاکٹر نارنگ صاحب کے اشارے پر اپنے رائٹرز فورم پر اب نیا محاذ کھولا ہے۔اس کی دلچسپ اور افسوسناک روداد الگ سے ایک مضمون میں پیش کر رہا ہوں۔سرِ دست ان کے فورم سے ریلیز کیے جانے والے ایک اعتراض کا جواب پیش کر رہا ہوں جو انہیں ان کے فورم پر ریلیز کرنے کے لیے بھیجا ہے۔دیکھتے ہیں وہ جواب ریلیز کرتے ہیں یا نہیں!ح۔ق)

میرا خیال ہے کہ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ صاحب کے حامیان کرام نے انہیں سرقے کے الزام سے بری کرانے کی بجائے مزید خراب کرانے کا تہیہ کرلیا ہے۔ابھی تک ڈاکٹر نارنگ کے دفاع کے لیے جو کچھ بھی لکھا گیا ہے اس میں ایک دفاعی مضمون ایسا نہیں ہے جس میں یہ دعویٰ کیا گیا ہو اور اسے دلیل کے ساتھ ثابت کیا گیا ہو کہ ڈاکٹر نارنگ نے اپنی تصنیف ''ساختیات،پسِ ساختیات اور مشرقی شعریات''میں مغربی کتابوں سے سرقے نہیں کیے۔اس کی بجائے ہر بار بات کو گھما کر کسی ذاتی مسئلہ میں الجھانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔کینیڈا کے ''غیر جانبدار''منیر پرویز سامی کی ''سابقہ غیر جانبدارانہ کاروائی''سے قطع نظر اب جدید ادب کی مجلس مشاورت میں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے نام کی شمولیت کو موضوع بنایا گیا ہے۔مجھے افسوس ہے کہ منیر پرویز سامی صاحب ایسے حیلے تلاش کر رہے ہیں جن کے جواب کے لیے مجھے کچھ نیا نہیں لکھنا پڑ رہا بلکہ پرانے اقتباسات میں ہی ان کے اعتراض کا جواب مل جاتا ہے۔ایسے فضول اعتراضات کے

جواب سے قطع نظر بنیادی سوال اب بھی یہی ہے کہ **کیا ڈاکٹر گوپی چند نارنگ صاحب نے اتنے بڑے پیمانے پر مغربی کتابوں سے سرقے کیے یا نہیں؟اور کیا ان کے حامیوں میں سے کسی ایک نے بھی علمی تہذیب کے ساتھ اس سوال کا سامنا کیا ہے یا نہیں؟ان سوالوں کے سنجیدہ علمی جواب دیئے بغیر نجات ممکن نہیں ہے۔نارنگ صاحب کی بھی اور ان کی چوریوں کا بے تکا دفاع کرنے والوں کی بھی۔**

جدید ادب کی مجلس مشاورت میں شمولیت یا عدم شمولیت کے حوالے سے بھی اعتراض کا جواب گزشتہ برس ۸/اپریل کو لکھ چکا ہوں۔معید رشیدی نے www.urdudost.com کے میگزین 'اردو ورلڈ'' کے شمارہ نمبرے کے لیے مجھ سے ایک انٹرویو لیا تھا۔اس انٹرویو کے دو سوالوں کے جواب یہاں پیش کر رہا ہوں۔

حیدر قریشی

سوالوں کے حصار میں:معید رشیدی کا حیدر قریشی سے انٹرویو

معید رشیدی : مابعدِ جدیدیت میں غزل کا کیا چہرہ بن رہا ہے۔کیا یہ غزل اپنے سابقہ موضوعات کی شدت کو رد کرتی ہے؟ مابعدِ جدید غزل،جدید غزل سے کس حد تک مختلف ہے؟اس کے امتیازات پر کچھ روشنی ڈالیے۔

حیدر قریشی : بھائی!کون سی مابعد جدیدیت کی غزل؟۔۔۔جو لوگ اپنی غزل کی بابت ایسا کچھ کہہ رہے ہیں وہ اپنی سادگی اور معصومیت میں محض کسی کو خوش کرنے کے لیے ایسا کہہ رہے ہیں۔ہندوستان میں جس ہستی نے مابعد جدیدیت کی تبلیغ کا بیڑا اُٹھایا تھا،وہ تو اپنی ''معرکتہ الآراء'' کتاب سمیت علمی لحاظ سے اپنے انجام کو پہنچ چکے ہیں۔ان کی پوری کتاب انگریزی کتابوں کے سرقہ کا شاہکار ثابت ہو چکی ہے اور انہیں اپنی صفائی میں یا چوری کے الزام سے بریت کے لیے ایک لفظ بھی لکھنے کی ہمت نہیں ہو رہی۔اسے محض الزام تراشی نہیں سمجھیں۔جدید ادب کے شمارہ :۹ اور ۱۰ میں عمران شاہد بھنڈر کے مضامین پڑھ کر میری بات کی تصدیق کر سکتے

ہیں۔ ہندوستان میں جس مابعد جدیدیت کے کرتا دھرتا کا یہ عبرتناک علمی انجام ہوا ہے،اس کے حوالے سے آپ کس مابعد جدید غزل کی بات کر رہے ہیں؟۔۔۔ لگے ہاتھوں آپ کو یہ بھی بتا دوں کہ خود مغربی ممالک کی یونیورسٹیوں کے نصابوں سے بھی اب اسے خارج کیا جا رہا ہے۔مزید تفصیل کے لیے جدید ادب کے شمارہ:۱۱ کا انتظار کیجیے۔

معید رشیدی : اپنے رسالے جدید ادب، کی مجلس مشاورت سے گوپی چند نارنگ کو آپ نے کیوں الگ کر دیا؟

حیدر قریشی : دراصل میں جدید ادب میں کسی مجلس مشاورت کے حق میں نہیں تھا۔دو دوستوں کے اصرار پر اس کا سلسلہ شروع کیا۔تب میں نے نارنگ صاحب سے بات کی۔انہوں نے شمولیت کے لیے حامی بھر لی،اور مشاورت کے طور پر اپنا ایک انٹرویو بھیج دیا،میں نے اسے شمارہ :۴ میں شائع کر دیا۔شمارہ: ۵ کے لیے انہوں نے اپنی ''معرکتہ الآراء'' کتاب ''ساختیات،پس ساختیات اور مشرقی شعریات'' کے بارے میں اپنے کسی نیازمند کا طویل مضمون بطور مشیر عنایت کر دیا۔مابعد جدیدیت کے ڈرامہ کو سمجھ لینے کے بعد اس کے سلسلہ میں مجھے شروع سے ہی تحفظات رہے ہیں،سو ظاہر ہے میں نے وہ مضمون شائع نہیں کیا۔اور ساتھ ہی نارنگ صاحب کی اس قسم کی مشاورت سے بچنے کے لیے ان کا نام ایک ہی شمارہ کے بعد حذف کر دیا۔ویسے سچی بات ہے میں اب بھی مجلس مشاورت کے حق میں نہیں ہوں۔محض دو دوستوں کی ضد کے آگے خاموش ہوں۔شاید اب بول پڑوں۔ویسے نارنگ صاحب کے حوالے سے یہ وضاحت کر دوں کہ اگرچہ میں نے ان کی ''معرکتہ الآراء'' کتاب پر لکھے ہوئے مضمون کو شمارہ: ۵ کے لیے ان کے بھیجنے کے باوجود شائع نہیں کیا تھا لیکن اس کے بعد شمارہ نمبر ۹ اور ۱۰ میں اسی کتاب پر تفصیلی مضامین چھپے ہیں اور ابھی یہ سلسلہ کہیں رُکا نہیں ہے،مزید سرقے بھی شائع کیے جا رہے ہیں۔

(سات اپریل ۲۰۰۸ء کو لکھا گیا۔مطبوعہ انٹرنیٹ میگزین **اردو ورلڈ** شمارہ:۷)

میں اپنے غیر جانبدار دوست منیر پرویز سامی کی مزید تسلی کے لیے اس قماش کے سارے

اعتراضات اپنی مطبوعہ تحریروں میں سے ہی پیش کرتا رہوں گا۔یار زندہ صحبت باقی۔اور حاضرین اس بار میری طرف سے بھی منیر سامی صاحب والی Cheers

تاہم بنیادی مسئلہ اب بھی یہ ہے کہ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ صاحب نے اپنی ''تصنیف'' ''ساختیات،پسِ ساختیات اور مشرقی شعریات'' میں اتنے بڑے پیمانے پر سرقے کیے ہیں یا نہیں؟اور ان کے حامیوں میں اس سوال کو سنجیدہ علمی سطح پر ابھی تک کیوں نہیں لیا جا رہا؟

(مطبوعہ روزنامہ **ہمارا مقصد** دہلی ۱۸اگست ۲۰۰۹ء)

نصرت ظہیر ایک بار پھر

۲ جولائی ۲۰۰۹ء کو اپنی آخری ای میل کے ذریعے نصرت ظہیر صاحب نے بحث ختم کر دی تھی لیکن اِس وقت جب ڈاکٹر نارنگ نے کینیڈا کے اپنے ایک حامی منیر سامی کے ذریعے پھر سے ذاتی اعتراضات کی مہم شروع کی ہے تو نصرت ظہیر صاحب کو بھی تھوڑی سی فرصت میسر آ گئی ہے۔انہوں نے آج ۱۷ اگست ۲۰۰۹ء کو ایک اوپن ای میل کی صورت میں مجھے انگریزی کا ایک لنک بھیجتے ہوئے لکھا ہے۔

''محترم حیدر صاحب! شکریہ۔آپ جس استقلال سے نارنگ صاحب کے بارے میں گمراہی کی تحریک چلا رہے ہیں،اس سب کے پس منظر میں یہ سب بھی ملاحظہ فرمالیں۔''

اس کا جواب پہلے میں نے انہیں ذاتی طور پر بھیجا لیکن پھر مناسب سمجھا کہ اسے بھی نصرت ظہیر صاحب کی اوپن میل کی طرح اوپن ہی ریلیز کیا جائے۔سو اسے اسی وقت ۱۷ اگست ہی کو اوپن میل کی صورت میں بھی ریلیز کر دیا۔میں نے یہ جواب لکھا۔

''میرے بھائی! اللہ آپ کے حال پر رحم کرے۔میں کوئی مہم نہیں چلا رہا، بے ہودہ الزامات کا جواب دے رہا ہوں۔نارنگ صاحب کے کسی دفاع کرنے والے نے اصل مسئلہ کو سنجیدگی سے نہیں لیا۔اور نہ ہی کسی نے بتایا ہے کہ میں نے پیش کردہ سارے حوالے پڑھ لیے ہیں،الزام غلط ہیں۔یہ علمی سطح پر نہایت شرمناک رویہ ہے۔باقی ذاتی سطح پر بے ہودہ الزامات سامنے آتے ہیں

،تو کیا آپ چاہتے ہیں کہ میں ان الزامات کا جواب بھی نہیں دوں؟

میرے کسی ایک مضمون کی نشان دہی کریں جو مجھے محض جواب میں نہ لکھنا پڑا ہو۔کسی ایک کی تو نشان دہی کریں۔ورنہ خدا کا خوف کریں،رزق خدا کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔''

چونکہ نصرت ظہیر صاحب کے ساتھ ہونے والی سابقہ ساری مراسلت آن ریکارڈ موجود ہے اور میں اسے محفوظ بھی کر چکا ہوں،اس لیے ضمیمہ کے طور پر یہ ای میلز بھی اسی کا حصہ سمجھی جائیں۔

حیدر قریشی (جرمنی سے)

۱۷ اگست ۲۰۰۹ء (پونے گیارہ بجے دن، جرمن ٹائم)

نوٹ: نصرت ظہیر صاحب نے جو انگریزی لنک بھیجا وہاں اس کے جواب میں اقبال نوید اور عمران شاہد بھنڈر کے عمدہ جواب چھپے ہوئے موجود ہیں اور تب سے اس فورم پر نارنگ صاحب کے حامیوں کو سانپ سونگھ گیا ہے۔پھر کوئی اس فورم پر نہیں آیا۔**ح۔ق**

ایک بار پھر اظہارِ رائے پر پابندی

خصوصی نوٹ: ڈاکٹر گوپی چند نارنگ صاحب کی اظہارِ رائے پر پابندیوں کے حوالے سے میرا پہلا مضمون سہ ماہی ''اثبات'' تھانے کے بعد ''ہندوستان ایکسپریس'' دہلی نے اہتمام کے ساتھ شائع کیا تھا۔ پھر یہ ''عکاس'' اسلام آباد کے تاریخی گوپی چند نارنگ نمبر میں بھی شائع کیا گیا۔ ڈاکٹر نارنگ صاحب کی ہمیشہ یہ کوشش ہوتی ہے کہ ان کی طرف سے ہونے والا ان کے حامیوں کا جھوٹا اور بے بنیاد پروپیگنڈہ تو ہوتا رہے لیکن ان کے جواب میں تصویر کا دوسرا رُخ کوئی نہ دکھائے۔ جدید ادب کے شمارہ نمبر ۱۲ کی سنسر شپ کی کہانی ''اثبات''، ''ہندوستان ایکسپریس'' اور ''عکاس'' گوپی چند نارنگ نمبر کے ذریعے دنیا بھر کے اردو قارئین پڑھ چکے ہیں۔ اب حالیہ دنوں میں جب ڈاکٹر نارنگ صاحب کے ساتھیوں کے بے بنیاد پروپیگنڈہ کے جواب میں میری طرف سے جواب چھپنا شروع ہوئے تو روزانہ ہمارا مقصد دہلی نے میرے مضامین اہتمام سے شائع کیے۔ لیکن افسوس کہ آج ۱۸ راگست ۲۰۰۹ء کی شام کو اس اخبار پر دباؤ ڈال کر میرے تازہ ترین مضمون کی اشاعت رکوا دی گئی ہے۔ یہ نارنگ صاحب کی طرف سے ''سنگ وخشت مقید ہیں اور سگ آزاد'' والا منظر بنا ہوا ہے۔ چونکہ نارنگ صاحب کی سنسر شپ کی پہلی کہانی بھی منظرِ عام پر لا چکا ہوں، اب موجودہ سنسر شپ کی خبر کے ساتھ اپنا تازہ مضمون بھی اردو دنیا کے سامنے پیش کر رہا ہوں، جس کی اشاعت رکوا دی گئی ہے۔ ڈاکٹر نارنگ کے سرقوں کی بحث سے متعلق اپنے سارے مضامین ''ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اور مابعد جدیدیت'' کے نام سے جلد ہی کتابی صورت میں لا رہا ہوں۔ یہ کتاب انڈیا اور پاکستان دونوں ملکوں سے چھپے گی، انشاء اللہ۔ ح۔ق)

مضمون ''پرویزی حیلوں کی روداد'' مذکورہ بالا نوٹ کے ساتھ ۱۸ راگست ۲۰۰۹ء کو ایک ہزار سے زائد ای میل ایڈریسز پر اوپن ای میل کی صورت ریلیز کیا گیا جس کے نتیجہ میں ایک اخبار میں اشاعت سے روکے گئے مذکورہ مضمون کو تین اخبارات نے شائع کر دیا۔ ح۔ق۔

پرویزی حیلوں کی روداد

نارنگ صاحب کی حمایت کا ایک اور راؤنڈ

''اتفاقیہ یا منصوبہ بند کارروائی؟'' مضمون روزنامہ ''ہمارا مقصد'' دہلی میں ۶ راور ۷ ر اگست کی تاریخوں کو دو قسطوں میں شائع ہوا۔ اور سات اگست ہی کو کینیڈا سے ایک انٹرنیٹ فورم کے ماڈریٹر منیر پرویز سامی صاحب نے مجھے اپنے فورم کی ای میلز بھیجنے کا آغاز کیا۔ میں ان کے فورم کا ممبر نہیں تھا۔ اس کے باوجود مجھے انہوں نے یکایک اپنی عنایات سے نوازنا شروع کر دیا۔ سات اگست کو اپنی ایک ای میل میں لندن کے فارسی چور کا گالیوں اور بدزبانی سے بھرا ہوا مضمون بھیجتے ہوئے منیر پرویز سامی صاحب نے لکھا:

Some Urdu poet has written, "baat niklay gee to phir door talak jaaey gi". Here is another article on the recent spike of accusations re Dr. Narang. I share it without comments.This shows you the unfortunate state of minds in Urdu literature.

ایک طرف تو موصوف کہہ رہے ہیں کہ وہ اپنے کمنٹس کے بغیر ایک مضمون شئیر کر رہے ہیں دوسری طرف نارنگ صاحب کے سرقوں کے جواب میں دھمکی دے رہے ہیں کہ ''بات نکلی تو بہت دور تلک جائے گی''

بات دور تک ضرور گئی لیکن گھوم پھر کر پھر نارنگ صاحب کے سرقوں پر آ گئی کہ ان سرقوں کے سلسلہ میں کوئی مدلل صفائی یا کوئی علمی وضاحت ابھی تک کسی طرف سے نہیں آسکی۔ سامی صاحب کی میل ملتے ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ یہ نارنگ صاحب نے ''اتفاقیہ یا منصوبہ بند کارروائی؟'' مضمون چھپنے کے نتیجہ میں حقائق سامنے آنے پر بحث کو مزید الجھانا چاہا ہے۔ اور اس بار انہوں نے کینیڈا سے منیر سامی صاحب کا انتخاب کیا ہے۔ ان کے انتخاب کی داد دیتا ہوں۔ انہوں نے چن کر بندہ نکالا ہے۔ بہر حال میں نے اُسی روز اور اُسی وقت منیر پرویز سامی کی اس میل کے جواب میں لکھا:

’’آپ کے ذریعے اگر نارنگ صاحب دوسرا راؤنڈ شروع کرنا چاہتے ہیں تو بسم اللہ! لیکن بنیادی مسئلہ ان کی چوریوں کا ہے۔اپنی چوریوں کا انہیں جواب دینا ہی پڑے گا‘‘۔

اس کے جواب میں انہوں نے اسی روز پھر اپنے فورم پر یہ تبصرہ کرتے ہوئے میری میل ریلیز کی

I am sharing this message from Haider sahib, who runs a web magazine from Germany and is among the main accusers of Dr. Narang. Objectivity requires that I share it.I am surprised at this comment, **"aap kay zareeay agar narang saheb doosra round shuru karna chhatay heN to bismillah!"**

You may have noted that I rarely share any item, message, or input about Narang sahib at our forum and in my communications.My interaction with Narang sahib is minimal. Such accusations are at best sad indeed.

You be the judge.

Cheers.

منیر سامی صاحب جس انداز میں اپنی غیر جانبداری کا اعلان کیے جا رہے تھے اور اسی اعلان میں جس طرح نارنگ صاحب کی چوریوں پر پردہ ڈالنے کی کوشش فرما رہے تھے، اس کے لیے کسی لمبے چوڑے ثبوت کی ضرورت نہیں، میرے اصل الفاظ اور ان میں سے نارنگ صاحب کی چوریوں والے الفاظ کو حذف کر کے پیش کرنا ہی یہ واضح کرنے کے لیے کافی ہے کہ موصوف نے نارنگ صاحب کے اشارے پر ہی یہ کاروائی شروع کی ۔تاہم اس کے علاوہ انہوں نے ظفر اقبال کی کالمانہ تحریر کو انگریزی میں بہت زیادہ حاشیہ آرائی کے ساتھ پیش کیا۔وہ حاشیہ آرائی ایسی ہے کہ اس سے ایک نہیں بحث کے کئی دروازے کھل جاتے ہیں لیکن خرابی یہ ہے کہ اس کے نتیجہ میں نارنگ صاحب کے سرقوں والی بات پس پشت چلی جاتی ہے۔اسی لیے ہمارے نزدیک دوسرے غیر متعلق مباحث کا ایک حد تک جواب دے دینے کے بعد ہمارا موضوع صرف یہ ہے کہ نارنگ صاحب نے سرقے کیے ہیں یا نہیں؟ یہ علمی مسئلہ ہے اور اس کا جواب علمی طور پر ہی آنا چاہیے۔ظفر اقبال کی کالمانہ تحریر کے جواب میں انگلینڈ کے اقبال نوید نے ایک عالمانہ مضمون تحریر کیا تھا۔اس کا عنوان ہی ظفر اقبال کے کالم کی آخری سطر کے آخری مصرعہ کو بنایا تھا’’اے سینہ زور کیا کوئی ایسا بھی چور ہے؟‘‘۔ظفر اقبال اخباری ضرورت کے تحت کالم لکھتے ہیں تاہم ان کے کالم اور اقبال نوید کے

مضمون سے کالمانہ تحریر اور عالمانہ تحریر کے فرق کو سنجیدگی کے ساتھ دیکھا جا سکتا ہے۔

منیر پرویز سامی صاحب ایک طرف تو جوش وخروش کے ساتھ اپنی غیر جانبداری کا اعلان کیے جا رہے تھے دوسرے طرف نہایت ایمانداری کے ساتھ سرقوں سے توجہ ہٹانے کے لیے غیر متعلق باتوں کو اچھالے چلے جا رہے تھے۔ان کے جوش وخروش کا یہ عالم تھا کہ صرف سات اگست کی تاریخ میں مجھے ان کی گیارہ ای میلز پڑھنا پڑیں۔اس دوران نارنگ صاحب کی اردو کے لیے عظیم خدمات کا چرچا کیا گیا۔

چونکہ مجھے ان کے ذریعے ائرٹکٹ والے بے ہودہ الزام کا علم ہوا تھا، چنانچہ میں نے فوری طور پر اس کا جواب لکھا جو روزنامہ ’’ہمارا مقصد‘‘ دہلی کے شمارہ ۱۰/اگست ۲۰۰۹ء میں شائع ہو گیا۔عام طور پر اس اخبار کو اگلے دن سے پہلے شام کو ہی انٹرنیٹ پر لگا دیا جاتا ہے۔میرا مضمون بھی ۹/اگست ۲۰۰۹ء کو آن لائن ہو چکا تھا۔چنانچہ میں نے اقبال نوید کا عالمانہ جوابی مضمون بطور اٹیچ منٹ بھیجا اور چند گھنٹوں کے بعد اپنے مضمون کا آن لائن لنک انہیں جرمن وقت کے مطابق پانچ بج کر تین منٹ پر بھیج دیا۔

یہ دونوں مضمون جو بے ہودہ الزامات کے رد کے ساتھ نارنگ صاحب کے سرقوں کو پوری طرح واضح کر رہے تھے، منیر سامی صاحب نے ریلیز نہیں کیے۔یوں ان کی غیر جانبداری کا بھرم کھل گیا۔لیکن بات صرف یہیں تک نہیں رہی۔ان کی غیر جانبدار شخصیت کے جوہر تو ابھی مزید کھلنا تھے۔کافی انتظار کے بعد ۱۰/اگست کو علی الصبح میں نے ان کی سات اگست کی ایک میل کے ساتھ انہیں REPLY کرتے ہوئے لکھا:

’’آپ کی یہ آخری میل ملی تھی، اس کے بعد آپ بالکل خاموش ہو گئے ہیں، جبکہ اسی تاریخ کو لگ بھگ تین گھنٹے کے بعد اقبال نوید صاحب نے ظفر اقبال صاحب کے کالم کا جواب ریلیز کر دیا تھا۔یہ جواب آپ کو خود بھی فارورڈ کر چکا ہوں اور کل تو آپ کی خدمت میں نارنگ صاحب کے نئے الزام کا جواب بھی بھیج دیا تھا۔لیکن آپ پتہ نہیں کیوں کوئی ریسپانس نہیں دے رہے۔یہ صرف یاد دہانی کی میل ہے‘‘

اس کے جواب میں ان کی طرف سے پہلے یہ میل آئی:

Hello Qureshi Sahib,Thanks. I became busy with some of my professional activities and am currently traveling.

اس کے ٹھیک نو منٹ کے بعد ان کی طرف سے یہ ای میل آئی:

I do not have access to my forum links. Regards. Munir
Sending you this message from my blackberry that does not provide full internet access.

لیکن دوسری ای میل کے دو منٹ کے بعد ابھی تک ''پرویزی حیلوں'' سے کام لینے والے منیر پرویز سامی صاحب کی یہ میل ملی: Quick question? Are you a member of the forum?

چونکہ موصوف کی نیت اب کھل کر ظاہر ہو گئی تھی۔اس پر میں نے فوری طور پر انہیں یہ میل بھیجی:

''مسٹر منیر سامی! جب آپ نے مجھے نارنگ کی بے ہودہ حمایت والی بیہودہ میلز بھیجنا شروع کی تھیں،کیا اُس وقت میں آپ کے فورم کا ممبر تھا؟۔آپ نے تب میری ای میل کو جس طرح کومنٹ دے کر ریلیز کیا،کیا میں اُس وقت آپ کے فورم کا ممبر تھا؟ آپ مجھے فورم کی ساری ریلیٹیڈ میلز فارورڈ کر رہے تھے(سب محفوظ ہیں) کیا میں اُس وقت آپ کے فورم کا ممبر تھا؟اب ظفر اقبال والے کالم کا علمی جواب سامنے آیا اور ائرٹکٹ کے بے ہودہ الزام کا جواب سامنے آیا تو آپ کو یکا یک یہ سوال یاد آ گیا۔ثابت ہوا کہ آپ کو نارنگ نے دوسرے راؤنڈ کے لیے تیار کیا تھا۔اور اب آپ علمی میدان میں دوسرا موقف بھی سامنے لانے سے گریز کر رہے ہیں۔مجھے پہلی میل سے ہی یہی آئیڈیا تھا۔اب آپ کی جان بوجھ کر کی جانے والی تاخیر سے اور اب آپ کے سوال نے سب کچھ واضح کر دیا ہے۔میرے لیے اتنا ریکارڈ ہی کافی ہے۔موج کیجیے''۔۔۔

میری اس میل کے سات منٹ کے بعد منیر پرویز سامی پرویزی حیلوں پر اس حد تک اتر آئے۔اپنی دانست میں وہ مجھے شاید بلیک میل کر رہے تھے ان کی میل آئی:

Hiader Sahib,
I have some personal questions if you cared to reply:
1. Are you a Pakistani by origin or Indian.
2. Did you live in India for a sustained period (2-3 years)
3. Did Gopi Chand Narang publish an article by you in a book titled Urdu ki

Nai BastiyaaN (I have not seen the book but a friend suggested that he may have seen such an article)
4. Where do you live now, Germany or Denmark. My understanding is Germany
I will be going to sleep in a few minutes and will look at my mail tomorrow.

اس پر میں نے اسی وقت فوری طور پر ان کو یہ ای میل بھیجی:

''آپ کے ہر سوال کا جواب ہے لیکن پہلے آپ کو جوابی ای میلز ریلیز کرنا چاہئیں۔ورنہ آپ کی نام نہاد غیر جانبداری کا بھرم کھل چکا ہے۔اور اس کے بعد مجھے آپ جیسے غیر جانبدار دوستوں سے کسی الجھاؤ کی ضرورت نہیں ہے۔اب تک کی ای میلز کا ریکارڈ ہی کافی ہے۔''

چوبیس گھنٹوں سے بھی زیادہ تاخیر کے بعد منیر پرویز سامی نے اگلے روز رات کو پونے گیارہ بجے کے قریب میری میلز ریلیز کیں۔اس میں ان کی بد نیتی واضح طور پر شامل تھی۔عام روٹین کے مطابق روزنامہ ''ہمارا مقصد'' کی ویب سائٹ پر تب تک گیارہ اگست کا اخبار آ چکا ہوتا اور جس مضمون کے لنک کو ریلیز کیا گیا وہ اس لنک پر موجود ہی نہ ہوتا۔اتفاق ہے کہ اس دن ہی نہیں اگلے دن بھی ۱۰ راگست کا اخبار آن لائن رہا۔اور ڈاکٹر نارنگ صاحب کے سرقوں کے حوالے سے اس مضمون کو بھی اور سابقہ مضامین کو بھی اخبار کے قارئین کی معمول کی تعداد سے بہت زیادہ پڑھا گیا۔

ابھی تک نارنگ صاحب کے کہنے پر مجھ پر جتنے بھی الزام لگائے گئے ہیں،ان کا جواب دینے کے لیے مجھے اپنی سابقہ تحریروں سے ہی اتنا میٹر مل جاتا ہے کہ نارنگ صاحب کا اعتراض باطل ہو جاتا ہے۔نیا کچھ لکھنے کی زیادہ ضرورت ہی پیش نہیں آتی۔جدید ادب کے شمارہ نمبر ۱۲ کو سنسر کرانے کی اوچھی حرکت سے لے کر نصرت ظہیر تا اپنے نئے حامی منیر سامی تک نارنگ صاحب نے جتنے حربے بھی آزمائے ہیں ان پر ہی الٹ کر پڑے ہیں۔بچپن میں ہم ایک کھیل کھیلا کرتے تھے۔''ہرا سمندر۔۔۔گوپی چندر۔۔۔بول میری مچھلی! کتنا پانی؟''اس میں چاروں طرف سے بچوں نے ایک دوسرے کے ہاتھ تھام کر حلقہ بنایا ہوتا تھا،درمیان میں ایک بچہ کھڑا ہو کر پانی کی سطح

بتاتا تھا۔ٹخنوں سے شروع ہوا پانی جب سر تک آجاتا تھا تو پھر اندر گھرا ہوا بچہ اپنے دونوں ہاتھوں سے ''یہاں سے تالا توڑیں گے'' کہہ کر ضرب لگاتا اور دوسرے بچے ''سپاہی کو بلائیں گے'' کہہ کر اپنی گرفت مضبوط کرتے۔ڈاکٹر گوپی چند نارنگ صاحب اگر غور کریں تو پانی ان کے گلے تک پہنچ چکا ہے۔مفادات کے اسیر رائٹرز سے لے کر ادبی چورا چکوں تک میرے خلاف کسی کی بے ہودہ الزام تراشیوں سے نارنگ صاحب کی سرقوں کے الزام سے بریت نہیں ہو سکتی۔اس الزام کا علمی وقار اور ادبی تہذیب کے ساتھ سامنا کرنا ہوگا۔مفادات کے اسیروں میں سے کوئی ان کی علمی بریت کرانے کا اہل ہی نہیں۔ابھی وقت ہے کہ نارنگ صاحب خود اپنے جرم کا سامنا کریں۔پانی ان کے گلے تک پہنچ چکا ہے۔ان کی جگہ مجھ سے (خدا نہ کرے، خدا نہ کرے) اتنے بڑے سرقہ کا گھناؤنا جرم ہوا ہوتا اور اس طرح علمی سطح پر وہ جرم کھل کر سامنے آگیا ہوتا تو میں پانی کے اپنے گلے تک پہنچنے کی نوبت نہ آنے دیتا۔

اتنے بڑے پیمانے کی چوری کا جرم کھل جانے کے بعد میرے لیے تو چلّو بھر پانی ہی کافی ہوتا۔شاید اس لیے کہ ایسے معاملات میں میرا ظرف اتنا ہی ہے۔

نارنگ صاحب دھیان سے دیکھیں۔۔۔سرقوں کے انکشاف کے بعد اور ان کے سارے حامیوں کی غیر علمی اور غیر ادبی حمایت نامی اوچھی حرکتوں کے بعد علمی و ادبی سطح پر پانی ان کے گلے تک پہنچ چکا ہے!

(مطبوعہ روزنامہ **جائزہ** لکھنو۔۲۰/اگست ۲۰۰۹ء)

روزنامہ **ہندوستان ایکسپریس** دہلی انٹرنیٹ ایڈیشن۔

روزنامہ **ہمارا مقصد** دہلی۔۲۴/اگست ۲۰۰۹ء

یہ مضمون ابھی تک اس لنک پر دستیاب ہے۔

http://dailyhindustanexpress.com/adbi_sargarmiyan.htm

ساختیات کے حوالے سے ایک پرانا خط

پسِ ساختیات کے تعلق سے ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کا مضمون میں نے پوری توجہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ڈاکٹر نارنگ صاحب نے نمبرز لگا کر جو وضاحتیں کی ہیں اس سے مجھے اس نئے ڈسپلن کو سمجھنے میں مزید آسانی ہوئی ہے، جس کے لیے میں ان کا شکر گزار ہوں۔

میں ابھی تک یہ سمجھ سکا ہوں کہ اس نئے ڈسپلن کے مطابق: متن کے پیچھے مصنف کی کوئی منشا نہیں ہوتی، جب کوئی متن وجود میں آتا ہے تو اس کے ساتھ ہی مصنف کی موت ہو جاتی ہے اور قاری کا جنم ہوتا ہے۔کوئی بھی تخلیق اپنا انفرادی تشخص نہیں رکھتی۔تخلیق کی کوئی خود مختار حیثیت نہیں ہے۔یہ ساری باتیں گمراہ کن ہیں۔

مصنف اپنی تخلیق کا پہلا قاری خود ہوتا ہے۔اس لیے اسے رد کرنا آسان نہیں۔ہاں مصنف کی ذاتی حیثیت، سماجی مرتبہ اور مالی خوشحالی کو ہمیشہ نظر انداز کرنا چاہیے لیکن ہمارے بعض ساختیاتی نقاد خود اس ''تنقیدی خوبی'' کا شکار ہیں۔اگر مصنف کی اپنی تخلیق کے پیچھے کوئی منشا نہیں تو اس کا مطلب ہے مصنف بے اختیار ہے۔لیکن اگر تخلیق کی بھی کوئی خود مختار حیثیت نہیں تو پھر دونوں باتوں میں تضاد ہے۔

ساختیاتی ناقدین اس ڈسپلن کو مشکل، گنجلک اور ژولیدہ انداز میں بیان کرنے کی بجائے اگر عملی تنقید کے نمونے پیش کریں تو زیادہ بہتر ہے۔نارنگ صاحب نے اس سلسلے میں اولیت کا اعزاز حاصل کیا ہے۔ان کا مضمون ''فیض کو کیسے نہ پڑھیں'' ساختیاتی عملی تنقید کا شاندار نمونہ ہے۔ایک طرف قاری کی آزادی کا احساس اتنا شدید ہے کہ مصنف کو موت کے گھاٹ اتارنا ضروری ہے۔دوسری طرف بحیثیت ناقد ہدایت نامہ جاری کیا جا رہا ہے کہ فیض کو کیسے پڑھیں اور

کیسے نہ پڑھیں۔

گستاخی معاف۔۔۔ادبی سطح پر یہ قاری کی آڑ میں تخلیقی لحاظ سے بانجھ نقادوں کی ادب پر مسلط ہونے کی ایک چال ہے اور عالمی سطح پر بعض امریکی دانشوروں کے احساسِ کمتری کی نفسیاتی تسکین۔

پسِ ساختیات کے امریکی ماہرین ایک یونیورسل تھیوری کے چکر میں ہیں۔یعنی ایک جنزل اصول جو سائنسی اصول کی طرح ایک عالمی سچائی کے طور پر لاگو ہو سکے،لیکن مکمل ڈی کنسٹرکشن ناممکن ہے۔جہاں مختلف افراد اور اقوام میں ڈھیر سارے اختلافات ہیں،وہیں ان میں بہت ساری similarities بھی ہیں۔سو مختلف طبقات اور اقوام پر سائنسی فارمولے کی طرح کوئی تھیوری کیسے لاگو کی جاسکتی ہے؟مکمل ڈی کنسٹرکشن سے صرف انارکی پھیلے گی۔فاشزم پھیلے گا۔امریکی فاشزم!

متن کی لامرکزیت اور من مانے معنی پیدا کرنے سے امریکی معاشرے کی تسکین ہو سکتی ہے جو اتنی بڑی طاقت ہونے کے باوجود کلچر کی دولت سے محروم ہے۔چنانچہ Grand Narrative کو توڑ کر ثقافتی سرمائے سے مالا مال اقوام کو ان کے ثقافتی ورثے سے لاتعلق کرنے والے دانشور،ان اقوام میں ثقافتی خلا پیدا کر کے ایک طرف امریکی احساسِ محرومی کو زائل کرنا چاہتے ہیں تو دوسری طرف اس ثقافتی خلا کو امریکی فاشزم سے بھرنا چاہتے ہیں۔

میڈونا کے جسم کے ساختیاتی مطالعہ کی جو کہانی امریکہ سے نکل چکی ہے اسے بھی مدِ نظر رکھیں۔مجھے افسوس ہے کہ مجھے نارنگ صاحب کے بنیادی موضوع کے ساتھ جڑے ہوئے اہم پوائنٹس کی طرف بھی اشارہ کرنا پڑا۔

(خط مطبوعہ سہ ماہی **دستک** ہوڑہ،شمارہ نمبر ۳،جولائی تا دسمبر ۱۹۹۴ء۔صفحہ نمبر ۲۳۶،۲۳۷)

میری سوچ

مابعد جدیدیت کے حوالے سے

اردو ادب نے گزشتہ ساٹھ برسوں میں کئی رنگ برنگے دَور دیکھے ہیں۔کبھی مختلف نظریاتی گروہوں نے اسے اپنے نظریات کی تشہیر کے لئے آلہ کار کے طور پر استعمال کرنا چاہا تو کبھی اسے صرف جمالیاتی حوالے سے دیکھنے پر اصرار کیا گیا۔کبھی اسے فرائڈین سوچ کے زیرِ اثر لانے کی کوشش کی گئی تو کبھی ادب کو مصنف کی ذاتی زندگی کے آئینے میں جانچنے کی کاوش کی گئی۔جدید افسانے میں جب تجریدیت کو فروغ دیا جانے لگا تب بڑی بے نیازی سے یہ کہا جانے لگا کہ ہم تو اپنے اندر کی آواز پر لکھتے ہیں۔قاری کو سمجھانا ہماری ذمہ داری نہیں ہے۔

یہ سارے ادوار مختلف رنگوں کی صورت اردو ادب کے گرد حاشیے بناتے رہے۔ان سب میں جزوی سچائیاں بھی تھیں۔تجریدیت کے تجربے میں بھی ایک جزوی سچائی تھی لیکن بدقسمتی سے اسے کلی سچائی سمجھ لیا گیا۔تجریدیت کے حوالے سے جدید اردو افسانے میں بے معنویت کا سیلاب آیا۔یہ بے معنویت کا سیلاب اس لحاظ سے بامعنی تھا کہ اردو افسانے کی پرانی معنویت کو، جو زنگ آلود ہو چکی تھی،صاف کر دے۔چنانچہ جن افسانہ نگاروں نے اس سیلابی دَور کو عبور کر لیا ان کے یہاں نئی معنویت کے انکھوے پھوٹنے لگے۔جنہوں نے سارے سیلابی تماشے کو دیکھنے کے بعد افسانہ نگاری کی دنیا میں قدم رکھا ان کے یہاں بھی یہی بامعنی صورت دکھائی دیتی ہے لیکن جو افسانہ نگار بے معنویت کی سیلابی حالت سے ابھی تک باہر نہیں آسکے ان کے یہاں ٹھہرے ہوئے پانی والی حالت دور سے ہی معلوم ہو جاتی ہے۔ان کے ساتھ یہ ظلم اس لئے ہوا کہ انہیں چند ایسے

ناقدین اور شارحین مل گئے جو ان کی بے معنی تحریروں سے دُور کی کوڑی لانے لگے۔ ابھی تک تخلیق اور تخلیق کار کی اہمیت بنی ہوئی تھی اور قاری کو یکسر نظر انداز کر دیا گیا تھا۔

جیسے ہی ہمارے یہاں ساختیاتی (اور ساخت شکن) تنقید کے چرچے ہونے لگے، بے معنی تحریروں میں خود ساختہ معنویت باور کرانے والے ناقدین اور شارحین کی بن آئی۔ میں اس نئے تنقیدی ڈسپلن کو بھی ایک جزوی سچائی سمجھتا ہوں لیکن ہمارے ایسے ناقدین جو تخلیقی صلاحیت سے عاری تھے انہیں یہ تنقیدی ڈسپلن کچھ زیادہ ہی راس آنے لگا۔ انہوں نے سوچا کہ جب ہم کسی بے معنی، بے تکی تحریر میں معانی کے صدرنگ جلوے پیدا کر لیتے ہیں تو پھر سارا کمال تو ہمارا اپنا ہوا۔ تخلیق کیا اور تخلیق کار کیا!___ چنانچہ قاری کی آڑ لے کر تخلیقی لحاظ سے بانجھ ناقدین نے تخلیق کار کو تخلیق سے اس طرح نکال باہر کیا جیسے مکھن میں سے بال___ تخلیق کار کو اپنی ہی تخلیق کے قاری ہونے کے حق سے بھی محروم کر دیا گیا۔ یہ کھیل تماشا ابھی جاری ہے۔ کبھی ادب کی ٹوپی سے خرگوش نکال کر دکھائے جا رہے ہیں اور کبھی رومال میں سے کبوتر برآمد ہو رہے ہیں۔ یار لوگ تماشے سے فارغ ہوں گے تو انہیں احساس ہوگا کہ ادب تو تخلیق کار، تخلیق اور قاری کے مابین ایک توازن قائم کرتا ہے۔

(دیوندر اسر کے ناولٹ **خوشبو بن کے لوٹیں گے** پر لکھے گئے مضمون کا ابتدائی حصہ)

(مطبوعہ ماہنامہ **اوراق** لاہور، شمارہ: فروری مارچ ۱۹۹۵ء

عالمی اردو ادب دہلی۔ شمارہ: ۱۹۹۵ء دیوندر اسر نمبر)

مابعد جدیدیت اور عالمی صورتحال

(جدید ادب جرمنی کے اداریہ کا زیر بحث حصہ)

ساختیات اور مابعد ساختیات کی بحث سے تعلق رکھنے والے کتنے ہی عالمانہ مضامین اب تک شائع ہو چکے ہیں۔ ان کے حق میں بھی۔۔۔ان کی مخالفت میں بھی۔۔۔اور ان کے درمیان توازن کی ایک حد قائم کرنے والے بھی۔ ان سب کی اپنی اپنی جگہ اہمیت ہے۔ ادبی مباحث کا اپنا ایک طریقِ کار ہوتا ہے، یہ چلتا رہنا چاہئے۔ تاہم یہاں یہ ذکر بے محل نہ ہوگا کہ جب ادب میں ترقی پسند تحریک اثر انداز ہونے لگی تھی تب بہت جلد یہ واضح ہو گیا تھا کہ یہ تحریک اپنے بہت سے مثبت اثرات کے باوجود سوشلزم اور کمیونزم کی تبلیغ اور دیگر مقاصد کے حصول کا فریضہ ادا کرنا چاہتی ہے۔ بعینہٖ جب ساختیات اور مابعد ساختیات کے مختلف زاویوں کے چرچے ہو رہے تھے تب بعض مضامین میں بڑی وضاحت سے باور کرانے کی کوشش کی گئی تھی کہ متن اور مصنف کا یکسر انکار کر کے قاری کی اہمیت کو اجاگر کرنا دراصل امریکی حلقوں کی طرف سے بعض مذہبی حلقوں کے خلاف اقدام کرنا ہے کیونکہ اس کی بنیاد پر تمام آسمانی کتب کے متن اور خالق کی نفی ہو جاتی ہے۔ اسی طرح جہاں جنرل تھیوری کے ناقابلِ عمل ہونے کی بات ہوئی وہیں Deconstruction کا مسئلہ بھی زیرِ بحث آیا۔ اب جبکہ امریکہ نے افغانستان اور عراق پر اپنی Deconstruction کی تھیوری کا اطلاق کر کے دکھا دیا ہے، یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ تھیوری کی دنیا میں رہنے کے ساتھ اس کے عملی مظاہر کے تناظر میں بھی اس کا جائزہ لیا جائے۔ یہ کام ہمارے اُن دانشوروں کے ہاتھوں زیادہ بہتر طور پر ہو سکے گا جو اس موضوع سے متعلق موافقت یا مخالفت میں لکھتے رہے ہیں، یا لکھ رہے ہیں۔ امید ہے ہمارے ایسے تمام دانشور اس طرف خصوصی توجہ فرمائیں گے، اور اس ڈسپلن کے عملی پہلوؤں کو زیرِ بحث لا کر زیادہ بہتر گفتگو ہو سکے گی۔

(مطبوعہ **جدید ادب** جرمنی، شمارہ: ۱، جولائی تا دسمبر ۲۰۰۳ء)

اداریے پر ردِ عمل

مابعد جدیدیت اور عالمی صورتحال

ڈاکٹر وزیر آغا (لاہور)

آپ کا اداریہ خصوصی طور پر قابلِ تعریف ہے۔ اس میں آپ نے ایک ایسا نکتہ اٹھایا ہے جس کے حوالے سے مجھے اپنے مضامین میں بہت کچھ لکھنے کی سعادت حاصل رہی ہے۔ بالخصوص میری کتاب ''معنی اور تناظر'' کے مضامین میں۔۔۔اصل مسئلہ یہ تھا کہ ساختیات اور پس ساختیات نے ''مرکز'' یا Logo-Centrism کے تصور کی نفی کی تھی۔ یہ کام فرانس کے مفکرین نے آج سے کم و بیش چالیس برس پہلے کیا۔ امریکی مفکرین نے تو فقط فرانسیسی مفکرین کی خوشہ چینی کی ہے۔ ساختیات نے مرکز کے بجائے رشتوں کے جال یعنی web of relations کی بات کی اور یہ بات اصلاً جدید طبیعات سے مستعار تھی۔ مگر ساخت میں 'مرکز' کی نفی کرنے سے مرکز کی نفی نہ ہو سکی۔ یہ نکتہ میں نے اپنے مضامین میں پیش کیا ہے۔ کیونکہ ساختیات کی پیش کردہ ساخت میں 'مرکز' ساری ساخت کے اندر ہر مقام پر موجود دکھائی دیتا ہے، جو وحدت الوجودی تصور ہے۔ گویا ساختیات والوں نے پرچم تو الحاد کا تھاما مگر 'مرکز' کی نفی کرنے میں بری طرح ناکام ہوئے۔ یوں خود ان کی تھیوری کے اندر 'مرکز' کی ہمہ گیری کے تصور کی توثیق ہو گئی۔

ساختیات والوں کے بعد ساخت شکن مفکرین یعنی Deconstructionists نے ساختیات کے تصورِ ساخت کی بھی نفی کر دی اور کہا کہ یہ کائنات ایک گنجلک یعنی Labyrinth ہے۔ اس کے جواب میں، میں نے لکھا ہے کہ اس سے بھی خالق کی نفی نہیں ہوتی، جیسے کہ نیطشے نے کوشش کی تھی۔ خود مشرقی دانش نے خالق کے انگنت اوصاف میں فہم سے ماورا ہونے کے وصف کی بھی نشاندہی کی ہے۔ حقیقتِ عظمیٰ کے تصور کو جو پردہ در پردہ اور حجاب اندر حجاب ہے انسان کا ذہن کیسے گرفت میں لے سکتا ہے!

میں نے اپنے مضامین میں اس بات پر بھی زور دیا ہے کہ تخلیق کاری میں'' مصنف، متن اور قاری'' تینوں شریک ہوتے ہیں، گویا مصنف یا خالق کی حیثیت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ بات کو سمیٹتے ہوئے میں یہ کہہ سکتا ہوں ساختیات اور پس ساختیات کے مفکرین نے جو نظریات پیش کئے ہیں خود ان نظریات کے اندر اک صورت خرابی کی موجود ہے۔ یعنی انہوں نے اپنے تصورات کو خود ہی Deconstruct کر دیا ہے۔

ناصر عباس نیر (جھنگ)

آپ نے یہ تجویز پیش کی ہے کہ 'تھیوری کی دنیا میں رہنے کے ساتھ اس کے عملی مظاہر کے تناظر میں بھی اس کا جائزہ لیا جائے۔' آپ کی اس تجویز کا محرک آپ کا یہ خیال ہے کہ تھیوری (ساختیات اور مابعد ساختیات) نہ صرف عالمی سیاسی مقاصد رکھتی ہے بلکہ افغانستان اور عراق پر امریکہ کی فوجی کارروائی کے ذریعے تھیوری کے یہ مقاصد حاصل بھی ہو چکے ہیں۔ گویا ان دو اسلامی ممالک میں جس بہیمیت کا امریکہ نے مظاہرہ کیا ہے اس کی ذمہ داری تھیوری پر ڈالی جا سکتی ہے اس ضمن میں آپ نے یہ بھی لکھا ہے کہ 'متن اور مصنف کا یکسر انکار کر کے قاری کی اہمیت کو اجاگر کرنا دراصل امریکی حلقوں کی طرف سے بعض مذہبی حلقوں کے خلاف اقدام کرنا ہے۔ کیونکہ اس بنیاد پر تمام آسمانی کتب کے متن اور خالق کی نفی ہو جاتی ہے۔'' معذرت کی ساتھ آپ کے ان خیالات میں اسی قسم کی سنسنی خیزی ہے جو صحافت (زرد صحافت) میں عام ہے اور آپ کے زاویہ نظر پر ترقی پسندوں کے روائتی فارمولے کا سایہ بھی محسوس ہو رہا ہے جو ہر ادبی تھیوری کے ڈانڈے سیاست سے جوڑتے ہیں۔ اداریئے میں آپ نے تھیوری کی صورت حال کو ترقی پسند تحریک کے مماثل ٹھہرایا بھی ہے۔ یہاں بعض وضاحتیں ضروری ہیں۔

میرے لیے یہ بات عظیم انکشاف* کا درجہ رکھتی ہے کہ تھیوری کے بل بوتے پر بڑی بڑی جنگیں لڑی جا سکتی ہیں۔ کاش ادبی نظریات اس قدر طاقت ور ہوتے کہ وہ عالمی سیاسی

معاملات کا رخ موڑ سکتے اور متعین کر سکتے ۔ یہ بات تو مانی جا سکتی ہے کہ جنگ اور بربریت کو
جائز ثابت کرنے کے لیے نظریات وضع کیے جا سکتے ہیں مگر تھیوری میں کسی بھی نظریے یا ڈسکورس
یا متن کو Deconstruct کرنے کی غیر معمولی صلاحیت ہے یعنی تھیوری نظریے یا متن میں مضمر ہر
قسم کی حکمت عملیوں کو منکشف کر سکتی ہے ۔ فوکو کی ڈسکورس کی تھیوری ہو یا نئی تاریخیت یا نسائی
تنقید یا پھر نو مارکسیت اس طرح تھیوری اپنی اصل کی روح سے مقتدر طبقوں کے ساتھ نہیں پامال
اور نظر انداز کردہ طبقوں کے ساتھ ہے ۔ تھیوری کمزور طبقات کی اس حمایت کے باوجود اگر ان کی
حالت زار میں انقلابی تبدیلی نہیں لا سکی تو اس کا باعث فقط یہ ہے کہ تھیوری میں بم کی طرح
طاقت نہیں ہوتی کہ فی الفور اور پوری شدت سے ظاہر ہو تھیوری کا تعلق فکری تبدیلی سے ہے جو
رفتہ رفتہ رونما ہو رہی ہے ۔ اور جہاں تک متن اور مصنف کے انکار کا سوال ہے تو اس ضمن میں
پہلی بات یہ ہے کہ مصنف کا انکار تو کیا گیا ہے متن کا ہرگز نہیں ۔ مصنف کا انکار کر کے دراصل
متن اور اس کی قرات کو مرکزی رول دیا گیا ہے اور مصنف کے انکار میں بھی کوئی سیاسی ہتھکنڈا
مضمر نہیں مصنف کا انکار ایک خاص علمی اور فکری پس منظر میں کیا گیا ہے ۔ یہاں تفصیل میں
جانے کی گنجائش نہیں فقط اتنا عرض ہے کہ مصنف کی موجودگی پر سوالیہ نشان ساختیات نے لگایا ۔
ساختیات جس مطالعاتی نہج کی داعی ہے وہ کلیت پسندانہ ہے ۔ یہ اس سسٹم کی جستجو کرتی ہے جس
کی وجہ سے اور جس کے تحت کوئی مظہر معنی کا حامل ہوتا ہے لہٰذا اصل اہمیت مظہر کے معنی کو نہیں ۔
اس کو پیدا کرنے والے نظام کو حاصل ہے ۔ معنی تو پراڈکٹ ہے ۔ اس زاویے سے فرد بھی ایک
پراڈکٹ اور سوشل کنسٹرکشن ہے ۔ سوسائٹی کا معنیاتی نظام (Signifying system) افراد اور
متون کے ذریعے اپنا اظہار کرتا ہے ۔ مصنف بھی لہٰذا خالق کے بجائے اس نظام کے اظہار کا
وسیلہ ہے ۔ گویا مصنف ادبی روایت یا شعریات کو خلق نہیں کرتا یہ شعریات مصنف کو وسیلہ بنا کر
اپنا اظہار کرتی ہے ، یہ باتیں ہمارے لیے اصطلاحات کی حد تک نئی ہیں مگر اپنے مطالب کے
اعتبار سے اجنبی نہیں ہیں ۔ مثلا ہم سب روایت کو بے حد اہمیت دیتے ہیں اور کسی فن پارے کی
قدر کے تعین کے لیے روایت سے استناد کرتے ہیں اسی طرح کسی فن پارے کے معنی کے کھوج

میں ہم منشائے مصنف کو بالائے طاق رکھنے کے عادی ہیں ۔ غالب کے اشعار کو غالب کے منشا
سے ہٹ کر پڑھا جاتا رہا ہے ۔ اور اسی وجہ سے غالب کو بڑا شاعر بھی قرار دیا جاتا رہا ہے کہ اس
کے اشعار میں معنی کی کثرت ہے ۔ اگر مصنف یا اس کے منشاء کو ملحوظ رکھیں تو فن پارے کی معنی
خیزی کا عمل نہایت محدود اور یک رخا ہو جائے گا ۔ اس اعتبار سے قرات کے وقت مصنف سے
صرف نظر کرنا ہی مناسب ہے ۔ مصنف کی نفی قرات کو آزاد اور معنی خیز بنانے کی خاطر کی گئی
ہے ۔ بایں ہمہ مصنف کی انفرادیت کی نفی ممکن نہیں (تفصیل کا یہ محل نہیں راقم کے اس موضوع پر
مقالات ملاحظہ کیے جا سکتے ہیں) آپ نے مصنف کے انکار کو امریکی حلقوں سے منسوب کیا ہے
۔ اس پر حیرت ہوئی ہے ۔ مصنف کی موت کا سنسنی خیز اعلان تو فرانسیسی نقاد رولاں بارت نے کیا
تھا ۔ ساختیات و پس ساختیات کی جنم بھومی بھی فرانس ہے ۔ اور فرانس نے عراق پر امریکی حملے
کی مخالفت کی تھی ۔ اور حق تو یہ ہے کہ غالباً فرانس ایسا ملک ہے جہاں تھیوری کو فروغ مل سکتا ہے
(اور ملا ہے) وگرنہ دوسرے ممالک میں اس پر شبہات کا ہی اظہار کیا گیا ہے ۔ امریکہ کے
فریڈرک جمی سن بھی تھیوری کے نقادوں میں شمار ہوتے ہیں ۔ باقی آئندہ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔!

حیدر قریشی

(ناصر عباس نیر کے جواب میں)

برادرم ناصر عباس نیر ادارایے پر ردِ عمل کا اظہار کرتے ہوئے تھوڑے سے جذباتی
ہو گئے ہیں ۔۔ میں نے ترقی پسند تحریک کے ابتدائی دنوں میں اس کے مخالفین کی جانب سے کی
جانے والی الزام تراشی کی نشان دہی بھی کی ہے اور ساتھ ہی مابعد جدیدیت مباحث کے آغاز کے
وقت کی جانے والی الزام تراشی کی ہلکی سی نشاندہی کی ہے ۔ بلکہ میں نے بہت سے سخت الفاظ کو
دہرانا مناسب نہیں سمجھا تھا ۔ مثلاً ڈاکٹر جمیل جالبی جیسے ثقہ نقاد اور دانشور نے تو اسے یہودیوں کی
سازش قرار دیا تھا ۔ ان مباحث کی ایک سطح یقیناً ادب کی حد تک ہے اور اسے وہیں رکھنا مناسب

ہےلیکن جب پیش آمدہ صورتحال کوان الزامات کی روشنی میں دیکھا جائے تو پھر ایسے ادبی مباحث کے بارے میں شکوک کا پیدا ہونا فطری بات ہے۔ یہ الزام نائن الیون کے سانحہ سے بہت پہلے کا ہے کہ مصنف کی نفی اور متن کے من چاہے معانی اخذ کرنے سے اُن امریکی دانشوروں کوسہولت ہو گی جو پہلے ہی سے بعض مذہبی عناصر کی بنیاد پرستی کے خلاف ہیں۔ بہت سیدھی سی بات ہے اس تصور کی بنیاد پر آسمانی کتب کے خالق کی نفی ہوتی ہے یوں یہ بات نیطشے کے اعلان کی ہی بازگشت بن جاتی ہے۔ میں نیطشے کے اعلان کا صرف اشارا دے رہا ہوں۔کھول کر نہیں لکھ رہا۔سو جب بہت پہلے سے مابعد جدیدیت اور امریکی عزائم کے تعلق سے چند امور کے بارے میں کھل کر شکوک کا اظہار کیا جا رہا تھا اور بعد میں وقت ان کو سچ ہوتا بھی دکھاتا ہے تو کیا ان ہولناکیوں کی نشاندہی کرتے ہوئے اسے امریکی دانش سے جوڑ کر دیکھنے کی کاوش کرنا کوئی جرم ہے؟اگر آپ کے نزدیک یہ زردصحافت ہے تو میں سوائے شرمندگی کے اظہار کے اور کیا کرسکتا ہوں!

جہاں تک متن کی نفی نہ کرنے کی آپ کی وضاحت کا تعلق ہے،اس سلسلے میں گزارش یہ ہے کہ مابعد جدیدیت نے قاری کو جو اہمیت دی ہے اس کے بعد فیض احمد فیض کی ایک نظم اور دھوبی کے بل یا منڈیوں کے بھاؤ میں سے کوئی فی ذاتہ عظیم یا کمتر نہیں رہتا۔ جب صورتحال ایسے مقام تک آجائے تو پھر متن کی کیا اہمیت رہ گئی؟

ناصر عباس نیر نے ایک جگہ لکھا ہے: **کاش ادبی نظریات اس قدر طاقت ور ہوتے کہ وہ عالمی سیاسی معاملات کا رخ موڑ سکتے اور متعین کر سکتے۔** میرا خیال ہے کہ بھائی ناصر عباس نیر وقتی غصہ کی روانی میں ایسا لکھ گئے ہیں ورنہ مغرب والوں کے سارے بڑے انقلابات اور تبدیلیوں کے عقب میں نظریات کی ہی کارفرمائی غالب رہی ہے۔طولِ کلام سے بچنے کے لئے اپنے اور ناصر عباس نیر صاحب کے مشترکہ ادبی بزرگ ڈاکٹر وزیر آغا کا ایک مختصر سا حوالہ پیش کئے دیتا ہوں۔

''مغرب میں بقائے بہترین کے تصور (نیطشے۔ناقل) نے نہ صرف افراد بلکہ قوموں کو بھی ''سپر''بن جانے کی ترغیب دی جس کے نتیجے میں بیسویں صدی کے سپر مین یعنی ہٹلر اور مسولینی

اور سٹالن پیدا ہوئے عالمی جنگیں لڑی گئیں جن میں سپر مین کے ساتھ سپر نسل (Super Race) اور سپر قوم (Super nation) کے تصورات کو بھی مہمیز لگی۔ پھر سپر بلاک کا تصور بھی بیدار ہو گیا جیسے امریکی بلاک اور روسی بلاک'' (**دستک اس دروازے پر** ص ا۷)

کیا اس تجزیہ سے ظاہر نہیں ہوتا کہ مغرب میں ادبی نظریات اور وہاں کی سیاسی وسماجی تبدیلیوں کا آپس میں کتنا گہرا تعلق ہے؟

اب دیکھئے جنرل تھیوری کا جو تصور پیش کیا گیا ہے بظاہر بڑا خوشنما ہے۔ساری دنیا کے انسانوں کے لئے ایک ہی تھیوری (حالانکہ مختلف ثقافتی تضادات خود ایسی عالمگیریت کی نفی کرتے ہیں) لیکن اس عالمگیریت کا اقتصادی اور سیاسی شاخسانہ کیا نکلا ہے؟ اس کے لئے ڈبلیوٹی او کی صورت میں امیر ممالک اور ملٹی نیشنل کمپنیوں کے عزائم کو دیکھ لیجئے اور اس کے خلاف خود مغربی ممالک کے عوام کا شدید ردعمل بھی دیکھ لیجئے۔ جنرل تھیوری کی عالمگیریت اور ڈبلیو ٹی او کی عالمگیریت میں کوئی اندرونی ربط ہے یا نہیں؟ اس پر غور کر لینے میں تو کوئی حرج نہیں۔

فرانس سے ساختیاتی تصورات کی ابتدا بے شک ہوئی لیکن یہ سلسلہ امریکی دانشوروں کو ہی راس آیا۔فرانس میں اس کو قطعاً کوئی اہمیت نہیں ملی۔ یہ ویسے ہی ہے جیسے تاریخ کی موت کا اعلان فرانس سے ہوا لیکن یہ بھی امریکی دانشوروں کو راس آیا کہ ان کی اپنی نجات تاریخ سے فرار اختیار کرنے میں تھی۔ امریکہ کی ذہانت کی داد دینی چاہئے کہ وہاں **سیاسی** (لمبی منصوبہ بندی)، **سماجی** (الیکٹرانک میڈیا) اور **ادبی** (یونیورسٹی لیول پر نظریات کا پرچار) ہر سطح پر پہلے سے ہوم ورک کرنا شروع کر دیا جاتا ہے۔Huntington نے ۱۹۹۷ء میں ''تہذیبوں کا ٹکراؤ'' لکھ دی تھی۔اس پر عملدرآمد آج ہو رہا ہے۔صرف عمل درآمد ہی نہیں ہو رہا بلکہ Huntington بہ نفیس نفیس امریکی میڈیا پر آکر اپنے موقف کو مزید واضح کر رہا ہے۔ چنانچہ حالیہ دنوں میں اس نے بڑے واضح الفاظ میں یہاں تک کہہ دیا ہے کہ میرے نزدیک بنیاد پرست مسلمان اور لبرل مسلمان میں کوئی تفریق نہیں ہے۔سارے مسلمان ہی ایک جیسے ہیں اور ان کا قلع قمع ہونا چاہئے۔ یہ ان کا ریڈیائی انٹرویو تھا جو امریکی حملوں کے دوران دیا گیا۔اس لئے آپ امریکی دانشوروں کے ایسے

بیانات اور ایسی ترغیبات کو اتنی سادگی سے نہ لیں۔ان کے اندر تک جانے کی کوشش کریں۔

مابعد جدیدیت کے مثبت ادبی ثمرات کو ضرور سامنے لانا چاہئے، ویسے ہی جیسے ترقی پسند تحریک کے مثبت ثمرات سے انکار نہیں کیا جاسکتا، تاہم جیسے اُس تحریک کے پس پشت سیاسی قوتوں کو مطعون کیا گیا تھا ویسے ہی اس ڈسپلن کے پس پشت مخصوص مقاصد کے تحت کام کرنے والے امریکی ذرائع کے وجود یا عدم وجود پر بات کرنے میں کوئی حرج نہیں۔اگر واقعی ایسا کچھ ہے تو اسے سامنے آنا چاہئے، اگر ایسا کچھ نہیں ہے تو غلط فہمی دور ہونی چاہئے۔اس لئے اس موضوع پر کھل کر گفتگو ہو جانی چاہئے۔اس پر ناراض نہیں ہونا چاہئے۔

میں امید کرتا ہوں کہ اس موضوع کو کسی کی ذاتی انا یا عناد کا باعث نہیں بنایا جائے گا۔اوریجنل اہلِ علم کسی کیمپ میں ہوں قابلِ قدر ہوتے ہیں۔سکہ بند سرکاری دانشوروں سے ہٹ کر ناصر عباس نیر حقیقتاً ہمارے ایک اہم دانشور ہیں۔ان سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ پیش آمدہ صورتحال اور زیر بحث مسئلہ کو ایک بار زاویہ تبدیل کرکے دیکھنے کی کوشش ضرور کریں گے۔

(مطبوعہ **جدید ادب** جرمنی، شمارہ نمبر ۲۔جنوری ۲۰۰۴ء)

*خوشی کی بات ہے کہ ناصر عباس نیر کی ایک حالیہ تحریر سے اندازہ ہوا کہ انہوں نے اپنے خیالات پر نظر ثانی کی ہے۔کسی ذاتی رنجش کو درمیان میں لائے بغیر اپنے افکار و خیالات پر نظر ثانی کر لینا یقیناً ایک صحت مند رویہ ہے جو پارٹی تبدیل کرنے کے منفی رویہ کے برعکس فکری ارتقا میں معاون ثابت ہوتا ہے۔ناصر عباس نیر کی تحریر کا مختصر سا اقتباس پیش ہے۔

’’کرۂ ارض کی واحد عالمی طاقت نے اکیسویں صدی میں کمزور ملکوں پر ڈسکورس ہی کی بنیاد پر جنگیں مسلط کی ہیں: پہلے اُن ملکوں سے متعلق ڈسکورس تشکیل دیے، اُنہیں میڈیا کے ذریعے پھیلایا اور باور کرایا، اور پھر ہر کھڑی عمارت اور ثابت و سالم شے کو اکھاڑ پچھاڑ دیا۔اس ڈسکورس میں کہیں نہ کہیں، مذہبی عُنصر ضرور شامل رہا‘‘ (سلیم آغا کی کتاب **ایک آواز** کا پیش لفظ: ص ۱۱)

میرے مضامین کی اشاعت کے دوران موصول ہونے والی بے شمار
ای میلز میں سے چند تاثرات

Thanks for sending me your piece. I read it with great interest and hope that your and Professor Naim's efforts will bear fruit. Please keep up the good work.   Warmly, **Muhammad Umar Memon** (U.S.A.

آپ کی متعدد تحریریں پڑھ ڈالیں اور آپ کی ہمت کی داد دی کہ ڈٹے ہوئے ہیں۔جب آدمی کی اپنی غرض وابستہ نہ ہو اور حق گوئی کا عزم بھی ہو تو پھر کام اسی بے باکی سے ہوتا ہے۔

محمد عمر میمن (شکاگو، امریکہ)

گوپی چند نارنگ کے سرقات کو آپ نے طشت از بام کرکے اردو ادب کی بڑی خدمت انجام دی ہے۔

Masha'allah, very well written. You are doing a great service to modern Urdu literature.I am circulating its copies among friends and have saved it for publication in the Khabar Namah at the prpoer time.

I also read and enjoyed your hard hitting reply to Munir Sami.

شمس الرحمن فاروقی (الہ آباد)

بہت شکریہ کہ آپ اتنا سارا میٹریل فارورڈ کردیتے ہیں لیکن کچھ لوگ بہت ڈھیٹ ہوتے ہیں، اپنی حرکتوں سے باز نہیں آتے ہیں۔ان کا پورا کیریر اسی طرح کے واقعات سے بھرا ہوا ہے۔

شمیم حنفی (دہلی)

آپ کے معرکے میرے علم میں ہیں اور مجھے خوشی اس بات کی ہے کہ آپ اتنے مخالف حالات کے باوجود جدید ادب بھی کامیابی سے نکال رہے ہیں اور باقی کام بھی بڑے زبردست انداز سے کر رہے ہیں۔اپنا خیال رکھیے کیونکہ جو معرکے آپ سرانجام دے رہے ہیں اس میں سب سے پہلے

اپنا خیال رکھنا بہت ضروری ہے۔ **احمد ہمیش** (کراچی)

ادھر نارنگ صاحب کی دھومیں مچی ہوئی ہیں۔ یہ شرمناک حرکتیں صرف نارنگ صاحب ہی نہیں کرتے اور بھی کئی صاحبان انگریزی ادب سے بہت کچھ ترجمہ کرکے اپنے نام سے پیش کر رہے ہیں۔ نارنگ صاحب تو اپنے عظیم سرقے پر ایوارڈ بھی وصول کر چکے ہیں۔ پہلے سنا کرتے تھے کہ فلاں شاعر نے شعر چوری کرلیا اب پوری پوری کتابیں ہضم ہو رہی ہیں۔ ان لوگوں کو بے نقاب کرنا ہم سب کی ذمہ داری ہے۔ **احمد حسین مجاھد** (ایبٹ آباد)

آپ ادب کی خدمت ہی نہیں کر رہے بلکہ جس بے باکی اور ہمت کا ثبوت دے رہے ہیں وہ آج تقریباً ناپید ہے۔ کام تو عمدہ ہو رہا ہے لیکن نارنگ کی دُم پکڑ کر چلنے والے کچھ چھٹ بھئیوں کو پبلسٹی مل رہی ہے، جو ادبی دنیا میں کسی شمار قطار میں نہیں ہیں۔ ان کو نظر انداز کرکے نارنگی چالبازیوں پر دھیان دیجئے۔ **علی جاوید** (دہلی)

شکریہ very, very interesting! **منیشا سیٹھی** (دہلی)

Thanks for drawing attention to this thought provoking article by Prof.Naeem. I never knew that an eminent Urdu scholar of the repute(??) of Dr. Narang should be indulging in this kind of reprehensible act of plagairism and getting an award for the same.I remember a case when Mr.Narayanan, once an editor of daily " Hindustan Times" who lifted pasages from another author's artilces and published as his own was summarily dismissed from the editorship and has since receded into oblivion.

Knowledge is any one person's monopoly but if you rely on someone else's views of opinion, you must gracefully acknowledge it and never pass on as your own original work. **Jagdish Prakash**

....

I thank you for being so proactively persuing the question of purity of thought, creativity and expression in Urdu making Dr.Gopi Chand Narang's case as symptomatic of the malaise.

While this kind of plagarism is condemnable unequivocally, Mr. C.M.Naim has drawn attention to another issue of manipulations in the corridors of powers to win partronage and positions.This is what had happened in case of Dr.Narang.This is a weakness of the system for which real talent suffers while

mediocrity thrives.

I also wish to inform you that I am presently in Canada and will move back to India around 25th September. **Jagdish Prakash**

----

thanks for your e-mail . i read your clarificatory article on Dr Narang's sarqas with interest. he seems to have crossed all limits of decency,

With regards **Arshad Kamal** ,

حیدر قریشی کی وضاحتی تحاریر سے یہ حقیقت سامنے آئی ہے کہ اصل موضوع سے ہٹ کر غیر ضروری موضوعات سامنے لائے جا رہے ہیں۔ ہمارے سامنے بارہ برسوں سے ایک ہی سوال رہا ہے آیا ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کی مذکورہ کتاب تصنیف کہلائی جائیگی یا ترجمہ وتالیف بلاحوالہ وصراحت؟۔۔۔ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کی بارہ سالہ خاموشی اور جناب عمران شاہد بھنڈر کی محققانہ مساعی سے اب یہ ثابت ہوگیا کہ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کی کتاب'' ساختیات، پسِ ساختیات اور مشرقی شعریات'' تصنیف نہیں بلکہ ترجمہ وتالیف بلاحوالہ وتصریح ہے اور یہ کتاب ادب کی تاریخ میں اس طرح درج ہوگی (بنام مطیع الرحمٰن عزیز)۔ **عبداللہ جاوید** (کینیڈا)

آپ کا پورا مضمون بڑی ہی توجہ سے پڑھا۔ گو نارنگ صاحب سے میرے کافی اچھے تعلقات ہیں۔ سرقہ والی بات پر مجھے زیادہ حیرت نہیں ہے۔ حیف ہے ان اردودانوں پر جو نارنگ صاحب کی جوتیاں سیدھی کرنے میں لگے رہتے ہیں۔ آپ شیر کی کچھار میں اکیلے ہی للکارنے والے ہیں کیونکہ اردو کے ضمیر فروش آپ کا ساتھ نہیں دیں گے۔ میری نیک خواہشات آپ کے ساتھ ہیں۔

آپ مجھے نوکری نہیں کرنے دیں گے۔ جناب جب اتنے زبردست مضامین اور مباحث کی تفصیلات بھیجیں گے تو انسان تو ان کے مطالعہ میں ہی لگا رہے گا۔ اور وہ ان دلچسپ مگر شرمناک حقائق کا مطالعہ کرنے میں پورا دن لگا دے گا۔ آپ کی میل ملی تو سمجھ لیجیے پڑھنے میں پورا دن ہی لگ گیا۔ اور میں نے سوچا کہ جب مجھے پڑھنے میں اتنا وقت لگا ہے تو آپ نے نوکری کے باوجود اور وہاں کی مصروف زندگی کے باوجود کیسے لکھنے میں اتنا وقت دیا ہوگا۔ یہ ادب کے لیے آپ کی بے لوث لگن ہی ہے۔ خدا آپ کو سلامت رکھے۔ **وسیم راشد**۔ دہلی

It is an interesting debate indeed. I would try to follow both sides as a student of Urdu literature. So far you seem to have been using proper references and that shows the objectivity.Although these kind of Manashqaat are unfortunate for Urdu literature however for some of us these become a great learning experience. **Ahmad Safi** (karachi)

سچائی، تمام تر خوب صورتیوں کے باوجود کس قدر ہولناک ہوتی ہے۔ڈاکٹر نارنگ صاحب کا مداح تھا، مگر اُن سے بہت پہلے حیدر قریشی صاحب آپ کی صلاحیتوں کا امین بھی۔افسوس ہے، ڈاکٹر صاحب ایک علمی گفتگو کو مذہب کی طرف لے جا رہے تھے۔آپ نے اُنھیں شیر بننے کا مشورہ بھی دیا مگر، نارنگ صاحب زمانہ شناس ہیں، اچھا کیا باز رہے۔یقین رکھتا ہوں آپ اور بہت سے علمی پردے اُٹھائیں گے۔ **خالد ملک ساحل**(ہمبرگ، جرمنی)

ماشاءاللہ بہت اچھا۔نارنگ جی پر آپ ہی ہاتھ ڈال سکتے ہیں، کسی اور میں اتنی جرات کہاں! میں نے مضمون دیکھا ہے۔کمال کی پکڑ کی ہے آپ نے۔مجھے بھی اس کی ان پیج کاپی send کریں۔میں بھی اس کو پوسٹ کرتا ہوں۔ **سلیمان جاذب**۔(دبئی)

ڈاکٹر نارنگ کی سرقہ شدہ کتاب کے مسئلہ کو جس طرح آپ نے اُٹھایا ہے، یہ بہت بڑا جرات مندانہ ادبی کارنامہ ہے۔اس ہمت و جرات پر مبارکباد! **مبشر سعید** (فرانس)

ڈاکٹر گوپی چند کی پہاڑ جیسی شخصیت اور آپ کی صورِ اسرافیل جیسی علمی و ادبی ضرب کی آواز، یہ تو قیامت ہی کا منظر ہو گیا صاحب!۔وہ جو سنتے تھے کہ پہاڑ روئی کے گالوں کی طرح اڑتے پھریں گے، علمی دنیا میں تو یہ سچ مچ ہوتا دیکھ رہے ہیں۔ **ناصر نظامی**(ایمسٹرڈیم، ہالینڈ)

حیرانی کی بات ہے کہ ڈاکٹر نارنگ اپنے کھلے سرقوں کے بارے میں کچھ کہنے کی بجائے الٹا شخصی الزام تراشیوں پر اتر آئے ہیں۔ان کی ادبی عظمت چکنا چور ہو چکی۔ **جیم فے غوری** (اٹلی)

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے سرقوں کی جھلک

عمران شاہد بھنڈر نے اپنے چار مضامین میں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے جن سرقوں کو متوازی اقتباسات کے ساتھ پیش کیا ہے، ان کو یہاں یکجا کر کے پیش کر رہا ہوں۔ان اقتباسات کے بعد آخر میں عمران شاہد کی نئی کتاب ''**گوپی چند نارنگ کا سرقہ تناظر اور مابعد جدیدیت**'' سے ایک طویل سرقہ شدہ اقتباس بھی شامل کیا جا رہا ہے۔ان تمام اقتباسات کے ساتھ یہاں عمران شاہد بھنڈر کے صرف وہ متعلقہ الفاظ شامل کر رہا ہوں جن کا اقتباسات کے تناظر میں پیش کیا جانا بے حد ضروری ہے۔ورنہ بنیادی مقصد صرف یہ بتانا ہے کہ عمران شاہد بھنڈر کے تحریر کردہ چار مضامین میں سے پیش کیے گئے یہ اقتباسات اور ایک نیا اقتباس، یہ سب ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے سرقوں کی صرف ایک جھلک ہیں۔عمران کی مذکورہ زیرِ اشاعت میں یہ سرقے اور مزید بے شمار سرقے سامنے آ رہے ہیں۔اور ان کے بعد عمران شاہد بھنڈر کی اسی حوالے سے ایک اور دلچسپ کتاب بھی آنے ہی والی ہے۔ **حیدر قریشی**

گوپی چند نارنگ لکھتے ہیں،

''اس سوسیئری تناظر سے ظاہر ہے کہ ادب کا وہ نظریہ جسے حقیقت نگاری کہتے ہیں ،قابلِ مدافعت نہیں ہے۔یہ دعویٰ کہ ادبی فارم حقیقت کا عکس پیش کرتی ہے، صرف تکرار بالمعنی، (Tautological) ہے۔اگر حقیقت سے ہماری مراد وہ حقیقت ہے جس کا ہم تجربہ کرتے ہیں ،یعنی جو تفریقی طور پر زبان کے ذریعے قائم ہوتی ہے تو یہ دعویٰ کہ 'حقیقت نگاری حقیقت کا عکس پیش کرتی ہے، دراصل یہ ہوا کہ، حقیقت نگاری اس دنیا کا عکس پیش کرتی ہے جو زبان کے ذریعے قائم ہوتی ہے'(Constructed in Language) ظاہر ہے یہ 'تکرار بالمعنی' (Tautology) کے سوا کچھ نہیں ہے۔۔۔۔۔(ص،۷۸)

کیتھرین بیلسی لکھتی ہے،

From this post-Saussurean perspective it is clear that the theory of literature as expressive realism is no longer tenable. The claim that a literary form reflects the world is simply tautological. If by 'the word' we understand the world we experience, the world differentiated by language, then the claim that realism reflects the world means that realism reflects the world constructed in language. This is a tautology................
(Belsey, Catherine. Critical Practice, London, Routledge, 2003, P,43)

گوپی چند نارنگ نے جو اقتباس درج کیا ہے اس میں سے بیلسی کے لفظ پوسٹ کو حذف کیا ہے جس سے بیلسی کا قائم کردہ معنی بھی متاثر ہوا ہے۔تاہم اس کے صفحہ نمبر کا حوالہ کہیں نہیں ہے۔دوسرا انھوں نے مندرجہ بالا اقتباس میں" تکرار بالمعنی" کو واوین میں لکھ کر یہ تاثر قائم کرنے کی کوشش کی ہے کہ یہ خاص اصطلاح کسی دوسرے نظریہ ساز سے ماخوذ ہے جبکہ حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔سارے کا سارا اقتباس جسے یہاں مختصراً پیش کیا گیا ہے بیلسی کی کتاب سے ماخوذ ہے ۔مندرجہ بالا تجزیہ کیتھرین بیلسی کا ہے گوپی چند نارنگ کا نہیں ہے

گوپی چند نارنگ نے محض ایک ہی اقتباس کو نقل نہیں کیا بلکہ بیلسی کی اسی کتاب سے کئی اقتباسات لفظ بہ لفظ اپنے نام سے ترجمہ کیے ہیں۔آیئے ایک اور اقتباس پر توجہ مرکوز کریں،

’’سیوسئر کی دلیل لفظوں کی ان کڑیوں پر مبنی ہے جو ایک تصور کے لیے مختلف زبانوں میں پائے جاتے ہیں۔’اگر لفظ ماقبل موجود تصورات کے لیے قائم‘ ہوتے تو ایک زبان سے دوسری زبان میں ان کے معنی متبادل پائے جاتے،لیکن ایسا نہیں ہے،(کورس ص،۱۱۶)حقیقت یہ ہے کہ مختلف زبانیں دنیا کی چیزوں کو مختلف طور پر دیکھتی اور ظاہر کرتی ہیں۔سیوسئر نے کئی مثالیں دی ہیں۔فرانسیسی میں ایک لفظ ہے Mouton اس کے برعکس انگریزی اس کے متبادل Mutton اور Sheep میں فرق کرتی ہے‘‘(گوپی چند نارنگ،ص،۶۸)۔

اب بیلسی کی طرف رجوع کرتے ہیں،

Saussure's argument depends on the different division of the chain of meaning in different languages. ' If words stood for pre-existing concepts' they would all have exact equivalents in meaning from one language to the next; but this is

not true' (Saussure, 1974: 116). The truth is that different languages divide or articulate the world in different worlds. Saussure gives a number of examples. For instance, where French has the single mouton, English differentiates between mutton, which we eat, and sheep.............(Belsey, 36-37).

طوالت کے باعث اس اقتباس کو بھی مختصر رکھا گیا ہے،تاہم انتہائی قابلِ توجہ امر یہ ہے کہ بیلسی نے اپنے تجزیے میں سیوسئر کی کتاب سے لیے گئے حوالے کو بشمول صفحہ نمبر پیش کیا ہے،جبکہ گوپی چند نارنگ نے یہ تاثر قائم کیا ہے کہ سیوسئر کا حوالہ انھوں نے بیلسی کی کتاب سے اخذ نہیں کیا بلکہ انھوں نے سیوسئر کا براہِ راست مطالعہ کیا ہے،یہ ادبی بددیانتی کی واضح مثال ہے۔

مذکورہ بالا حوالہ جات کے علاوہ روسی ہئیت پسندی پر لکھے گئے باب کا بیشتر حصہ جوناتھن کلر کی Strucuralist Poetics سے نقل کیا گیا ہے۔اس کے علاوہ رومن جیکبسن پر لکھا گیا مکمل باب ٹیرنس ہاکس کی کتاب Structuralism and Semiotics سے لفظ بہ لفظ گوپی چند نارنگ نے ترجمہ کیا ہے۔آیئے اقتباس ملاحظہ فرمائیں،

’’روسی ہئیت پسندوں کے ضمن میں ہم مکاروو سکی کے اس خیال سے بحث کر آئے ہیں کہ’ زبان کا تخلیقی استعمال فن پارے میں زبان کو ’پیشِ منظر‘ میں لے آتا ہے،یعنی اظہاری عمل اپنے آپ کو نمایاں کرتا ہے،جیکبسن اس پر اضافہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ شاعری کی تخلیقی زبان میں استعاراتی پہلو نمایاں رہتا ہے،نثر کی تخلیقی زبان میں انسلاکی پہلو زیادہ حاوی رہتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ مرادفیت (equivalence) شاعری میں اس قدر اہمیت رکھتی ہے۔متوازیت بھی مرادفیت کا ایک رخ ہے۔۔۔۔۔۔۔‘‘(۱۴۰)

اب Terence Hawkes کے اس انگریزی اقتباس پر توجہ فرمائیں،

We have already noticed the argument of Jakobson's fellow Prague school critic Mukarovsky with regard to foregrounding: that the aesthetic use of language pushes into the foreground the 'act of expression' itself. Jakobson offers the more refined proposal that the metaphoric mode tends to be foregrounding in poetry, whereas the metonymic mode tends to be foregrounded in prose. This makes the operation of 'equivalence' of crucial importance to poetry........(Structuralism and semiotics, 1984, p80)

میرا یہ دعویٰ ہے کہ گوپی چند نارنگ نے ٹیرنس ہاکس کی کتاب Structuralism and Semiotics کو چند ایک پیراگراف کی ترتیب کو تبدیل کرکے ساری کی ساری کتاب ترجمہ کرکے اپنے نام سے شائع کرادی ہے۔

ٹیرنس ہاکس کی کتاب Structuralism and Semiotics میں سے گوپی صاحب نے ساری کتاب لفظ بہ لفظ محض ان کی ترتیب بدل کر نقل کی ہے۔ مثلاً اگر ٹیرنس ہاکس ایک پیراگراف پہلے لکھتا ہے تو اسی پیراگراف کو گوپی صاحب درمیان میں لکھ دیتے ہیں۔ اگر الفاظ وہی ہیں تو محض پیراگراف کی ترتیب بدلنے سے کیا ہوگا۔ ویسے یہ ہوسکتا ہے کہ اس وقت ان کے ذہن میں جولیا کرسٹیوا کی intertexuality کی تھیوری گردش کررہی ہو۔ آیئے اس پیراگراف کا flavour دیکھتے ہیں۔ ٹیرنس ہاکس، Todorov پر لکھے ہوئے باب میں کچھ یوں کہتا ہے،

The notion that literary works are ultimately about language, that their medium is their message, is one of the most fruitful of structuralist ideas and we have already noticed its theoretical foundations in the work of Jakobson. It validates the post-romantic sense that form and content are one, because it postulates that form is content. At one level, this permits, for instance, Todorov to argue that the ultimate subject of a work like The Thousand and One Night is the act of story-telling, of narration itself: that for the character involved- indeed for homo loquens at large- narration equals life: 'the absence of narration death'........... (Structuralism and Semiotics, p,100).

گوپی چند نارنگ صاحب یوں تحریر فرماتے ہیں،

''یہ خیال کہ ادبی فن پارہ زبان سے قائم ہوتا ہے، اور زبان ہی پیغام ہے: 'THE MEDIUM IS THE MESSAGE' بنیادی ساختیاتی نظریہ ہے، اور جیکب سن نے اس کی نظریاتی بنیادوں کو واضح کیا تھا۔ یہ خیال پَس رومانوی تصور کی بھی توثیق کرتا ہے کہ فارم اور مواد دراصل ایک ہیں، کیونکہ اس میں یہ تصور جاگزیں ہے کہ فارم ہی مواد ہے۔ اسی خیال کی بنا پر تودوروف نے ایک جگہ یہ نہایت دلچسپ بحث اٹھائی کہ الف لیلیٰ جیسے شاہکار کا بنیادی 'موضوع' دراصل خود کہانی کہنے کا 'عمل' ہے کیونکہ کردار سب انسان (HOMO LOQUENS) یعنی 'بولنے والے جاندار' ہیں اور ان کے

لیے کہانی سنانا زندہ رہنے کی علامت ہے اور کہانی کے ختم ہوجانے کا مطلب ہے موت۔''

'NARRATION EQUALS LIFE: THE ABSENCE OF NARRATION DEATH'

P' 92 (ساختیات، پس ساختیات اور مشرقی شعریات، صفحات، ۱۲۹۔۱۳۰)۔

مندرجہ بالا پیراگراف قارئین سے انتہائی توجہ کا تقاضہ کرتا ہے۔ گوپی صاحب نے اوپر والے اقتباس میں بعض فقرے واوین میں بھی لکھے ہیں اور اس کے بعد آخر میں ایک فقرہ انگریزی میں بھی لکھا ہے اور یہاں تک کہ صفحہ نمبر بھی درج کیا ہے جس میں اصل ذریعے کا حوالہ نہیں ہے۔ اس سے وہ یہ تاثر قائم کرنے کی کوشش کررہے ہیں کہ انہوں نے Todorov کی کتاب کا مطالعہ کیا ہے۔ جبکہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ لفظ بہ لفظ اس اقتباس کا مطالعہ ٹیرنس ہاکس کی کتاب کے صفحہ نمبر ۱۰۰ پر کیا جاسکتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ نقاد گوپی چند نارنگ صاحب نے جان بوجھ کر ایسا کیا ہے تاکہ قاری کہیں اپنی توجہ ٹیرنس ہاکس کی کتاب کی طرف مرکوز نہ کر بیٹھے۔

اب ایک اور اقتباس پر توجہ مرکوز کرتے ہیں۔ ٹیرنس ہاکس کہتا ہے،

We have already noticed the arguments of Jakobson's fellow Prague school critic Mukarovsky with regard to 'foregrounding': that the aesthetic use of language pushes into the foreground 'the act of expression' itself. Jakobson offered the most refined proposal that the metaphoric mode tends to be foregrounded in poetry, whereas the metonymic mode tends to be foregrounded in prose. This makes the operation 'equivalence' of crucial importance to poetry, not only in the area of analogy, but also in the area of 'sound' of those metrical, rythmic and phonic devices,.......continue. (Terence Hawkes, P, 80).

نارنگ صاحب کا یہ توجہ طلب اقتباس یوں ہے،

''روسی ہیئت پسندوں کے ضمن میں ہم مکاروسکی کے اس خیال سے بحث کرآئے ہیں کہ 'زبان کا تخلیقی استعمال فن پارے میں زبان کو 'پیش منظر' میں لے آتا ہے، یعنی اظہاری عمل اپنے آپ کو نمایاں کرتا ہے۔ جیکب سن اس پر اضافہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ شاعری کی تخلیقی زبان میں استعاراتی پہلو نمایاں رہتا ہے، نثر کی تخلیقی زبان میں انسلاکی پہلو زیادہ حاوی رہتا ہے۔ یہی وجہ

ہے کہ 'مرادفیت' EQUIVALENCE شاعری میں اس قدر اہمیت رکھتی ہے۔ متوازیت بھی مرادفیت کا ایک رخ ہے۔ ردیف وقوافی، اصوات، اوراوزان وبحور تکرار ومتوازیت کی جو اہمیت ہے، وہ اسی قبیل سے ہے'' جاری ہے (ص، ۱۴۰)۔

آیئے ٹیرنس ہاکس کے ایک اور اقتباس پر غور کرتے ہیں،

Poetic language is deliberately self-conscious, self-aware. It emphasises itself as a medium over and above the 'message' it contains: it characteristically draws attention to itself and systematically intensifies its own linguistic qualities. As a result, words in poetry have the status not simply of vehicles for thought, but of objects in their own right, autonomous concrete entities, In Sausure's terms, then, they cease to be 'signifiers' and become 'signifieds', ...(P, 63-64).

نارنگ صاحب لکھتے ہیں:

''شعری زبان عمداً اپنے وجود کا احساس دلاتی ہے، یہ خود آگاہ اور خود شناس ہوتی ہے۔ یہ موضوع یا پیغام سے بلند تر ہو کر، جو اس کے ذریعے بیان ہوا ہے، خود اپنی حیثیت کا احساس دلاتی ہے۔ شعری زبان کا بنیادی تفاعل توجہ کو اپنی جانب مبذول کرنا اور اپنے اوصاف کو نمایاں کرنا ہے۔ نتیجتاً شعری زبان میں الفاظ فقط خیال یا جذبے کی ترسیل کا ذریعہ نہیں رہتے، بلکہ خود ٹھوس حقیقت بن جاتے ہیں جو قائم بالذات ہوتی ہے۔ ساسئیر کے معنی میں لفظ محض signifiers نہیں رہتے بلکہ signified بن جاتے ہیں۔۔۔'' جاری ہے (ص، ۸۹)۔

ٹیرنس ہاکس کے اس اقتباس پر غور فرمائیں،

Formalist theory realised that the 'meaning' habitually carried by words can never be fully seperated from the words themselves because no word has 'simple' one meaning. The 'meaning of A is not simply A1 or A2 or A3, for A has a larger capacity to mean which derives from its particular context or use. No word is ever really a mere proxy for a denoted object. Infact the transaction of 'meaning' has a coplexity of dimensions which the 'poetic' use of language further complicates. Poetry, in short, does not seperate a word from its meaning, so much as multiply - bewildering - the range of meanings available to it... (P, 64).

نارنگ صاحب کے اس اقتباس پر نظر ڈالتے ہیں:

''ہیئت پسندوں کو اس کا احساس تھا کہ لفظ معنی سے اور معنی لفظ سے یکسر جدا نہیں کیے جا سکتے، اور معنی کا نظام اتنا سادہ نہیں جتنا بالعموم سمجھا جاتا ہے۔ الف کا مطلب محض الف ۱، الف ۲، یا الف ۳ نہیں ہے کیونکہ الف کے معنی سیاق وسباق سے اور دوسرے لفظوں سے مل کر یکسر بدلتے رہتے ہیں۔ کوئی لفظ کسی شے کے محدود معنی میں ہمیشہ کے لیے قائم نہیں ہے۔ پس شعری زبان اگرچہ لفظ کو قائم بالذات کرتی ہے لیکن اس کو معنی سے جدا نہیں کرتی، بلکہ اس کے مختلف مفاہیمی امکانات کو ابھارتی ہے، یعنی معنیاتی قوسِ قزح کو پیدا کرتی ہے۔ معنی کی یہ بوقلمونی اکثر طلسمِ خیال یا حیرت و استعجاب کی کیفیت کی حامل ہوتی ہے۔۔۔۔۔۔۔'' جاری ہے (ص، ۸۹)۔

پروفیسر رامن سیلڈن لکھتے ہیں،

There is another stand in poststructuralist thought which believes that the world is more than a galaxy of text, and that some theories of textuality ignore the fact that the discourse is involved in power. They reduce political and economic forces, and ideological and social control, to aspects of signifying processes. When a Hitler or a Stalin seems to dictate to an entire nation by wielding the power of discourse, it is absurd to treat the effect as simply occurring within discourse. It is evident that real power is exercised through discourse, and that this power has real effects....... The father of this line of thought is the German philosopher Nietzsche, who said that people first decide what they want and then fit the facts to their aim: 'Ultimately man finds in things nothing but what he himself has imported into them.' All knowledge is an expression of the 'will to power'.This means that we can not speak of any absolute truths or of objective knowledge.... Foucault regards discourse as a central human activity, but not as a universal, 'general text', a vast sea of signification. He is interested in the historical dimention of discursive change. What it is possible to say will change from one era to another. In science a theory is not recognised in its own period if it deos not conform to the power consensus of the institutions and official organs of science. Mendel's genetic theories fell on deaf ears in the 1860s; they were promulgated in a 'void' and had to wait until the twentieth century for acceptance. It is not enough to speak the truth; one must be 'in the truth'.

(Selden, Raman. Contemporary Literary Theory,3rd ed,
Britain,1993,P158-159)

گوپی چند نارنگ کے سرقے کی جانب توجہ مبذول کرتے ہیں،

''پس ساختیات میں ایک فکری دھارا اور بھی ہے جو اصرار کرتا ہے کہ 'متنیت' (TEXTUALITY) ہی سب کچھ نہیں، بلکہ دنیا میں طاقت کے کھیل میں بجائے متن کے 'ڈسکورس' (مدلل مبرہن بیان) شامل ہے۔ مثل فوکو (MICHEL FOUCAULT) کا بنیادی نقطہ یہ ہے کہ 'متنیت' کے نظریے سیاسی اور سماجی طاقتوں اور آئیڈیالوجی کو 'معنی خیزی' کے وسائل قرار دے کر ان کی حیثیت کو گھٹا دیتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جب کوئی ہٹلر، موسولینی، یا اسٹالن ایک پوری قوم کو اپنے حکم پر چلاتا ہے، تو ایسا 'ڈسکورس' کی طاقت کے ذریعے ہوتا ہے۔ اس طاقت کے اثرات کو 'متن' تک محدود رکھنا مہمل بات ہے۔ فوکو کہتا ہے کہ اصل طاقت کا استعمال 'ڈسکورس' کے ذریعے ہوتا ہے، اور اس طاقت کے ٹھوس اثرات مرتب ہوتے ہیں۔۔۔۔ نٹشے نے کہا تھا کہ 'لوگ پہلے طے کرتے ہیں کہ انھیں کیا چاہیے، اور پھر حقائق کو اپنے مقصد کے مطابق ڈھال لیتے ہیں'۔ نتیجتاً انسان کو اشیاء میں وہی کچھ نظر آتا ہے جو ان میں خود اس نے داخل کیا ہے۔ فوکو اس بحث کو آگے بڑھاتے ہوئے کہتا ہے کہ تمام علم طاقت کی خواہش (WILL TO POWER) کا مظہر ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم مطلق صداقت یا معروضی علم کی بات نہیں کر سکتے۔ لوگ کسی فلسفے یا سائنسی نظریے کو صرف اسی وقت تسلیم کرتے ہیں، جب وہ اپنے عہد کے سیاسی اور دانشورانہ مقتدرات یا آئیڈیالوجی یا سچائی سے لگا کھائے یا وقت کے رائج پیمانوں پر پورا اُترے۔ فوکو 'ڈسکورس' کو ذہنِ انسانی کی مرکزی سرگرمی قرار دیتا ہے، ایک عام آفاقی 'متن' کے طور پر نہیں بلکہ 'معنی خیزی' کے ایک وسیع سمندر کے طور پر۔ وہ تبدیلی کی تاریخی جہت میں دلچسپی رکھتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جو کچھ کہنا ممکن ہے وہ ایک عہد سے دوسرے عہد میں بدل جاتا ہے۔ سائنس میں بھی کوئی نظریہ اس وقت تک تسلیم نہیں کیا جاتا، جب تک کہ وہ سائنس کے مقتدر اداروں اور ان کے سرکاری ترجمانوں کے طاقتی توافق سے مطابقت پیدا نہ کر لے۔ فوکو کہتا ہے کہ مینڈل (MENDEL) کے علم توالد کے نظریے کی ۱۸۶۰ء کے زمانے میں کوئی پذیرائی نہ ہوئی تھی

گویا یہ خیالات خلاء میں پیش ہوئے تھے، اور ان کی اپنی قبولیت کے لئے بیسویں صدی کا انتظار کرنا پڑا۔ اس کا مشہور قول ہے کہ 'صرف سچ بولنا کافی نہیں ہے سچائی کے 'اندر' ہونا بھی ضروری ہے' (نارنگ، ص، ۱۹۴۔۱۹۶)۔

پروفیسر سیلڈن کے جوناتھن کلر پر لکھے گئے باب سے اقتباس پیش کرتے ہیں۔ سے لڈن لکھتے ہیں،

Jonathan Culler (see also chapter 5) has argued that a theory of reading has to uncover the interpretative operations used by readers. We all know that different readers produce different interpretations. While this has led some theorists to despair of developing a theory of reading at all, Culler argues in The Pursuit of Signs (1981) that it is this variety of interpretation which theory has to explain. While readers may differ about meaning, they may well follow the same set of interpretative conventions.... (Selden, P62).

نارنگ صاحب کا کارنامہ ملاحظہ فرمائیں،

''جوناتھن کلر اس بات پر زور دیتا ہے کہ قرأت کے نظریے کے لئے ضروری ہے کہ وہ افہام و تفہیم اور تحسین قاری کو ضابطہ بند کر سکے جو بالعموم قارئین قرأت کے دوران استعمال کرتے ہیں۔ اس بات کو نظر میں رکھنا چاہیے کہ ایک ہی متن سے مختلف قاری مختلف مفاہیم برآمد کرتے ہیں۔ اگرچہ تعبیر و تفہیم کا یہی تنوع دراصل قاری اساس تنقید کے بہت سے نظریہ سازوں کے لئے دقّت کا باعث بنتا ہے، لیکن کلر بحث کرتے ہوئے کہتا ہے کہ نظریے کا چیلنج یہی ہے کہ مختلف قرأتوں کے امکانات اور مفاہیم کے تنوع کو ضابطہ بند کیا جائے، اس لئے قارئین میں معنی کا اختلاف تو ہو سکتا ہے لیکن تفہیم و تعبیر کے لئے قارئین جو پیرائے اور طور طریقے استعمال کرتے ہیں، ان میں کچھ تو ملتے جلتے ہونگے، اُن کو دریافت کرنے کی کوشش کی جا سکتی ہے'' (نارنگ، ص، ۳۱۸۔۳۱۹)۔

سیلڈن کے جولیا کرسٹیوا پر لکھے گئے باب میں سے اس اقتباس کو ملاحظہ فرمائیں،

The word 'revolution' in Kristeva's title is not simply metaphoric. The possibility of radical social change is, in her view, bound up with the

disruption of authoritarian discourses. Poetic language introduces the subversive openness of the semiotic 'across' society's 'closed' symbolic order: 'What the theory of the unconscious seeks, poetic language practices, within and against the social order.' Sometimes she considers that the modernist poetry actually prefigures a social revolution which in the distant future will come about when society has evolved a more conplex form. However, at other times she fears that bourgeois ideology will simply recuperate this poetic revolution by treating it as a safety valve for the repressed impulses it denies in society. Kristeva's view of the revolutionary potential of women writers in society is just as ambivalent.... (Selden, P142).

نارنگ صاحب کو دیکھیں،

''کرسٹیوا کا انقلاب کا تصور یہ ہے کہ سماجی ریڈیکل تبدیلی مقتدر ڈسکورس میں تخریب اور خلل اندازی کے عمل پر منحصر ہے۔شعری زبان سماج کے ضابطہ بند اور مقید علامتی نظام میں نشانیاتی تخریب کاری کی آزادہ روی (کھلی ڈھلی تنقید) کو راہ دیتی ہے۔لاشعور جو چاہتا ہے،شعری زبان اس کو سماج کے اندر اور سماج کے خلاف برت سکنے پر قادر ہے۔کرسٹیوا کو یقین ہے کہ سماجی نظام جب زیادہ ضابطہ بند، زیادہ پیچیدہ ہو جائے گا تو نئی شعری زبان کے ذریعے انقلاب لایا جاسکے گا،لیکن اس کو یہ بھی خدشہ ہے کہ بورژوا آئیڈیالوجی ہر نئی چیز کو اپنا کر اس کا ڈنک نکال دیتی ہے، چنانچہ ممکن ہے کہ شعری انقلاب کو بھی بورژوا آئیڈیالوجی ایک سیفٹی والو کے طور پر استعمال کرے، ان دبے ہوئے ہیجانات کے اخراج کے لئے جن کی سماج میں بالعموم اجازت نہیں ہے''(نارنگ،ص،۲۰۲)۔

جیسا کہ ہم نے پہلے بھی عرض کیا ہے کہ نارنگ صاحب کی ساری کتاب ترجمہ ہے،لیکن انہوں نے چونکہ خود کو مترجم نہیں کہا اس لئے ہمیں ان کو سارق کہنا پڑ رہا ہے۔سیلڈن کی تمام کتاب چند ایک اقتباسات چھوڑ کر نارنگ صاحب نے اپنے نام سے شائع کرائی ہے۔ نارنگ صاحب کے لئے بیٹھ کر سرقہ لکھنا اس لئے آسان ہو گیا کہ ایوارڈ ان کا منتظر تھا۔کسی بھی دوسرے شخص کے لئے یہ کام آسان نہیں ہے کہ وہ قاری کو یقین دہانی کرانے کے لئے اپنے وقت کا زیاں کرتا رہے۔اس لئے یہاں پر سیلڈن کی کتاب سے اقتباسات کے مزید حوالے دینے کی بجائے ہم

صرف صفحات کی تفصیل دینے پر ہی اکتفا کریں گے۔سنجیدہ قاری اصل مآخذات تک ضرور رسائی حاصل کریں گے۔

رامن سیلڈن کی کتاب کے صفحات ---------------- گوپی چند نارنگ کی کتاب کے صفحات

79 -106------------------------27 - 42

288 - 329------------------------49 - 70

234 - 240------------------------149 - 158

243 - 267------------------------86 - 103

ہمارا یہ دعویٰ ہے کہ سیلڈن کی کتاب سے دیئے گئے تمام صفحات گوپی چند نارنگ نے اپنے نام سے شائع کرائے ہیں۔حیرت زدہ کرنے والا امر یہ ہے کہ نارنگ صاحب نے اس کتاب میں شاید ہی چند الفاظ خود تحریر کئے ہوں۔راقم کی حیرت میں اس لئے بھی اضافہ ہوا کہ نارنگ صاحب کو کتاب پر بطورِ مصنف اپنا نام لکھنے کی کیا ضرورت تھی۔کیا ان کو خود بھی یہ خبر نہ ہوسکی کہ آج نہیں تو کل یہ راز آشکار ہو جائے گا۔

سیلڈن کی کتاب سے نارنگ صاحب کے سرقے کے حقائق بمعہ تمام تر تفصیل پیش کرنے کے اب ایک دوسری کتاب کی جانب رجوع کرتے ہیں۔اس کتاب سے نارنگ صاحب نے رولاں بارتھ پر لکھے گئے مضمون کا سرقہ فرمایا ہے۔یاد رہے کہ اسی مضمون کے بعض حصے جوناتھن کلر کی Structuralist Poetics سے چرائے گئے ہیں۔لیکن یہاں پر جو اقتباسات پیش کئے جا رہے ہیں وہ John Sturrock کی کتاب سے لئے گئے ہیں۔سٹرک نے اس کتاب میں پانچ مابعد جدید مفکروں پر لکھے گئے مضامین کو مرتب کیا ہے۔جس مضمون کا نارنگ صاحب نے سرقہ کیا ہے وہ سٹرک کا اپنا تحریر کردہ ہے۔سٹرک نے مصنفانہ سچائی کا لحاظ کیا اور تمام مضامین کو ان کے مصنفوں کے نام سے شائع کیا۔ نارنگ صاحب نے دوسری زبان کا بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے بارتھ پر لکھے ہوئے مضمون کو اپنے نام کرلیا۔آیئے دونوں کا موازنہ پیش کرتے ہیں۔ جان سٹرک لکھتے

ہیں،

Existentialism, on the contrary, preaches the total freedom of the individual constantly to change..... Barthes, like Sartre, pits therefore the fluidity, the anarchy, even, of existence against the rigor mortis of essentialism; not least because, again following Sartre, he sees essentialism as the ideology which sustains that tradional bugbear of all French intellectuals, the bourgeoisie... he writes at the conclusion of his most feroriously anti-bourgeois book, the devastating Mythologies (1957.........

In one way, Barthes goes beyond Sartre in his abhorrence of essentialism. Sartre, as so far as one can see, allows the human person a certain integrity or unity; but Barthes professes a philosophy of disintegration, whereby the presumed unity of any individual is dissolved into a plurality or discontinuous. This biography is especially offensive to him as a literary form because it represents a counterfeit integration of its individual. It is a false memorial to a living person.......

(Sturrock, John. Structuralism and Since. London, Oxford University Press,1979, P 53)

نارنگ صاحب کی طرف چلتے ہیں:

''لازمیت'' (ESSANTIALISM) کے مقابلے میں وجودیت نے انسان کی اس بنیادی آزادی پر زور دیا تھا جو ہر تبدیلی کی بنیاد ہے۔ بارتھ بھی سارتر کی طرح لازمیت اور جبریت کے خلاف ہر طرح کی بغاوت بلکہ نراجیت (انارکی) تک کا قائل تھا۔ سارتر کی طرح وہ بھی لازمیت کو بورژوازی کا نشان سمجھتا تھا، اور پوری قوت سے اس کو رد کرتا تھا جیسا کہ اس کی ایک ابتدائی بحث انگیز تصنیف (1957) MYTHOLOGIES سے ظاہر ہے۔

لازمیت اور بورژوازی کی مخالفت میں بارتھ ایک اعتبار سے سارتر سے بھی آگے نکل گیا، کیونکہ سارتر وحدت اور سالمیت (INTEGRITY) کا منکر نہیں تھا، لیکن بارتھ اپنی دھن میں بورژوازی سالمیت کے خلاف شکست وریخت کے فلسفے کی حمایت تک سے گریز نہیں کرتا تھا۔ اس کا کہنا تھا انسان کی وحدت ایک طرح کا واہمہ ہے، اگر غور سے دیکھا جائے تو ہم میں سے ہر ایک دراصل 'کئی' ہے۔ وہ وحدت کا سرے سے قائل ہی نہیں تھا، خدا کا بھی نہیں، ہر وہ چیز جو غیر مسلسل

اور غیر واحد ہے، بارتھ اس کی حمایت کرتا تھا۔ اس کا کہنا ہے کہ سوانح اسی لئے ادب نہیں کہ وحدت پیدا کرنے کی کوشش میں جعل کا نمونہ پیش کرتی ہے اور غیر اصل ہے (نارنگ، ص،۱۶۲۔۱۶۱)۔

جان سٹرک کے اسی مضمون میں سے ایک اور اقتباس پر غور کرتے ہیں،

his arch enemy is the doxa, the prevailing view of things, which very often prevails to the extent that people are unaware it is only one of several possible alternative views. Barthes may not be able to destroy the doxa but he can lesson its authority by localizing it, by subjugating it to a paradox of his own......

Barthes is only fully to be appreciated, then, as some one who set out to disrupt as profoundly as he could the orthodox views of literature he found in France...........The grievances against contemporary criticism with which Barthes began were deeply influential on what he came to write later. There were four main ones. First, he objected that literary criticism was predominantly ahistorical, working as it did on the assumption that the moral and the formal values of the texts it studied were timeless.....Barthes was never a member of the Communist party - let us say neo-Marxist objection. He dismissed existing histories of French literature as meaningless choronicles of names and dates... (Sturrock, P, 54-55)

اسی صفحے پر نارنگ صاحب نے قاری کی آنکھ میں دھول جھونکنے کے لئے پیراگراف کی تفصیل کو بڑی مہارت سے تبدیل کیا ہے، اگر قاری بھی سمجھ بوجھ کا حامل ہو تو یہ سرقہ بھی اس کی نظر سے اوجھل نہیں رہ سکتا۔ نارنگ صاحب کے اقتباس کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

''DOXA یعنی اشیاء و صورتحال کا تسلیم شدہ تصور جسے اکثریت قبول کرتی ہو، اُسے بارتھ اپنا سب سے بڑا دشمن سمجھتا تھا۔ وہ DOXA کو تباہ کر سکا یا نہیں، لیکن اس نے اسکا احساس دلا دیا کہ حقیقت کا وہ تصور جسے بالعموم لوگ صحیح سمجھتے ہیں، حقیقت کے ممکنہ تصورات میں سے محض ایک ہوتا ہے۔۔۔ چنانچہ ادب کے مقلدانہ تصور پر بھی رولاں بارتھ نے کاری ضرب لگائی۔ مدرسانہ تنقید اور مکتبی تنقید پر اس نے بار بار حملے کیے۔ اُسے ادبی نظریات پر چار خاص اعتراض تھے: اوّل یہ کہ ادبی تنقید میں غالب رجحان غیر تاریخیت کا ہے، کیونکہ عام خیال ہے کہ متن کی ہئیتی اور اخلاقی اقدار دائمی ہیں۔ بارتھ کبھی کمیونسٹ نہیں رہا لیکن ادب کی تاریخیت کے بارے میں اس کا نظریہ

مارکسی نہ سہی تو نو مارکسی ضرور ہے۔اس نے اپنے عہد کی ادبی تاریخوں کو ناموں اور سنین کا بے جان پُشتارہ قرار دیا'' **(نارنگ،ص،۱۶۳۔۱۶۲)۔**

سٹرک نے بارتھ کے حوالے سے دوسرا اعتراض ان الفاظ میں اٹھایا ہے:

Barthes's second complaints against academic criticism was that it was psychologically naive and deterministic....when critics chose to explain textual data by biographical ones, or the work by the life....The elements of a literary work - and this is an absolutely central point in literary structuralism - must be understood in the first instance in their relationship to other elements of that work..... (Sturrock, P,56)

نارنگ صاحب نے سٹرک کے بارتھ کے حوالے سے دوسرے اعتراض پر ان الفاظ میں قبضہ جمانے کی کوشش کی ہے:

''مکتبی یک سطحی تنقید پر اس کا دوسرا اعتراض یہ تھا کہ مکتبی تنقید کا نفسیات کا شعور مجرمانہ حدتک معصومانہ ہے۔سوانح معلومات کی مدد سے متن کو سمجھنا اس کے نزدیک ناقابلِ معافی جرم تھا۔۔اس کے نزدیک ادبی متن کے عناصر کو صرف ان داخلی رشتوں کی مدد سے سمجھا جاسکتا ہے جو وہ متن کے دوسرے عناصر سے رکھتے ہیں۔یہ نکتہ ساختیاتی فکر کا بنیادی پتھر ہے'' **(نارنگ،ص، ۱۶۳)۔**

سٹرک کے بارتھ کے حوالے سے مکتبی تنقید پر تیسرا اعتراض سٹرک کے الفاظ میں کچھ یوں ہے:

They could see only one meaning in the texts they concerned themselves with, and that one meaning was usually a very literal one. This they subsequently held the meaning of the text, and that to search further for supplementary or alternative meanings was futile. They were men of narrow and autocratic temper who fancied they were being scientific when they were merely being culpably dogmatic. Their minds were closed to the ambiguities of language, to the co-existence of various meaning within a single form of words,.......
(Sturrock, P 57-58)

نارنگ نے سٹرک کے بیان کردہ بارتھ کے تیسرے اعتراض کو ان الفاظ میں اپنے سرقے کی بھینٹ چڑھایا ہے:

''مکتبی تنقید متن کے صرف متعینہ طے شدہ معنی کو صحیح سمجھتی ہے اور نہایت ڈھٹائی سے اس پر اصرار کرتی ہے۔متعینہ معنی تو صرف لغوی معنی ہو سکتے ہیں، اور ادب میں اکثر و بیشتر بے ہودگی کی حدتک غلط ہوتے ہیں۔مکتبی نقادوں کے بارے میں بارتھ نے لکھا ہے کہ اُن کا ذہن چھوٹا اور نظر محدود ہوتی ہے، وہ ادعایت کا شکار ہیں اور ادب میں اکثریت کے علمبردار ہیں۔۔۔ادب فی نفسہ ابہام سے لبریز ہے اور ایک ہی فارم میں کئی معنی ساتھ ساتھ عمل آراء ہو سکتے ہیں'' **(نارنگ،ص، ۱۶۳)۔**

نارنگ صاحب نے مندرجہ بالا تمام مصنفین کا تمسخر اڑانے کے بعد رابرٹ سکولز پر بھی اپنی 'سچائی' کو مسلط کیا ہے۔آیئے پہلے سکولز کی طرف چلتے ہیں:

Attempting to distinguish between constant and variable elements in a collection of a hundered Russian fairytales, Propp arrives at the principle that though the personage of a tale are variable, their functions in the tales are constant and limited. Describing function as "an act of a character, defined from the point of view of its significance for the course of the action," Propp developed inductively four laws which put the study of folk literature and of fiction itself on a new footing. I their baldness and universality, laws 3 and 4 have the shocking effect of certain scientific discoveries:

1. Functions of characters serve as stable, constant elements in a tale, independent of how and by whom they are fulfilled. They constitute the fundamental components of a tale.
2. The number of function known to the fairy-tale is limited.
3. The sequence of functions is always identical.
4. All fairy tales are of one type in regard to their structure.

(Morphology of the Folktale, pp. 21,22,23)

In comparing the functions of tale after tale, Propp discovered that his total numbers of functions never surpassed thirty-one, and that however many of the thirty-one functions a tale had (none has every one) those that it had always appeared in the same order.... After the initial situation, in which the members of a family are enemerated or the future hero is introduced, a tale begins, consisting of some selection of the following functions in the following order:

1. One of the members of a family absents himself from home.
2. An interdiction is addressed to the hero.

3. The interdiction is voilated.
4. The villain makes an attempt at reconnaissance.
5. The villain recieves information about his victim.
6. The villain attempts to deceive his victim in order to take possession of him or of his belongings.
7. The victim submits to deception and thereby unwittingly helps his enemy.

یہ فہرست اکتیس پر جا کر ختم ہوتی ہے۔مکمل فہرست دینے سے مضمون کی طوالت میں اضافہ ہو جائے گا، جو قطعی غیر ضروری ہوگا۔اگر مکمل فہرست دی جائے تو صفحات کی تعداد تقریباً نو تک چلی جاتی ہے۔اس لئے قاری ان صفحات پر از خود غور کرے، جبکہ نارنگ کے سرقے کی تفصیل میں قلمبند کر رہا ہوں

Scholes, Robert, Structuralism in Literature, New York, Vail-Ballou Press,1974 P, 62-70.

نارنگ صاحب کی حرکت پر توجہ مرکوز کرتے ہیں:

’’پروپ نے ایک سولوک کہانیوں کا انتخاب کیا اور اپنے تجزیے سے بتایا کہ کرداروں اور ان کے ’تفاعل‘(FUNCTIONS) کی بناء پر ان لوک کہانیوں کی داخلی ساخت کو بے نقاب کیا جا سکتا ہے، اور ان کی درجہ بندی کس خوبی سے کی جا سکتی ہے۔اس نے ان کہانیوں کے مختلف اور مشترک عناصر کا تجزیہ کیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ ان کہانیوں میں اگر چہ کردار بدلتے رہتے ہیں، لیکن کرداروں کا ’تفاعل‘ (FUNCTIONS) مقرر ہے، اور تمام کہانیوں میں ایک سا رہتا ہے۔ کردار کے تفاعل کو کردار کا وہ عمل قرار دیتے ہوئے جو کہانی کی معنویت کے دوسرے اجزا سے جڑا ہوا ہے، پروپ نے استقراری طور پر چار قوانین مرتب کیے جنھوں نے آگے چل کر لوک ادب اور بیانیہ کے مطالعے کے نئی دنیا فراہم کردی۔آفاقی اطلاقیت اور صداقت کے اعتبار سے قانون تین اور چار کو اکثر مفکرین نے سائنسی دریافت کا درجہ دیا ہے:

۱۔کرداروں کے تفاعل کہانی کے راسخ اور غیر مذبذب عناصر ہیں، قطع نظر اس سے کہ کون ان کو سر انجام دیتا ہے، یہ کہانی کے بنیادی اجزا ہیں۔
۲۔’تفاعل‘ کی تعداد کہانیوں میں محدود ہے۔

۳۔’’تفاعل‘ کی ’ترجیع‘(SEQUENCE) ہمیشہ ایک سی رہتی ہے۔
۴۔باوجود تنوع کے تمام کہانیوں میں ساخت ایک جیسی ہے۔

کرداروں کے ’تفاعل‘(FUNCTIONS) کے اعتبار سے ایک کے بعد ایک کہانی کا تجزیہ کرتے ہوئے پروپ اس نتیجہ پر پہنچا کہ کہانیوں میں کرداروں کے ’تفاعل‘(FUNCTIONS) کی کُل تعداد اکتیس ۳۱ سے کسی طرح نہیں بڑھتی، اور اگر چہ بعض کہانیوں میں عمل کی کچھ لڑیاں نہیں ملتیں، لیکن ہمیشہ اُن کی ترتیب وہی رہتی ہے۔۔۔۔۔۔ابتدائی منظر کے بعد جب گھرانے کے افراد سامنے آتے ہیں، اور ہیرو کی نشاندہی ہو جاتی ہے تو کہانی ان تفاعل(FUNCTIONS) میں سے سب یا بعض کی مدد سے اسی ترتیب سے بیان ہوتی ہے:

۱۔خاندان کا کوئی فرد گھر سے غائب ہو جاتا ہے۔
۲۔ہیرو کی ممانعت کی جاتی ہے۔
۳۔ممانعت کی خلاف ورزی کی جاتی ہے۔
۴۔ولن جاسوسی کی کوشش کرتا ہے۔
۵۔ولن کو اپنے ’شکار‘(VICTIM) کے بارے میں اطلاع ملتی ہے۔
۶۔ولن اپنے ’شکار‘ کو دھوکہ دیتا ہے تا کہ اس پر یا اس کے مال و اسباب پر قبضہ کرلے۔
۷۔’شکار‘ دامِ تزویر میں آجاتا ہے اور نادانستہ اپنے دشمن کی مدد کرتا ہے۔ **(نارنگ، ص، ۱۰۹۔۱۱۰)۔**

نارنگ صاحب بھی اس فہرست کو اکتیس تک لفظ بہ لفظ نقل کرنے کے علاوہ سکولز کے تجزیے کو لفظ بہ لفظ نقل کرتے ہوئے صفحہ نمبر ۱۱۷ تک لے جاتے ہیں، لیکن کہیں بھی حوالہ دینا ضروری نہیں سمجھتے۔

ان صفحات کے علاوہ نارنگ صاحب اسی کتاب کے مختلف حصوں سے بھی خاطر خواہ اقتباسات کا سرقہ کرتے دکھائی دیتے ہیں۔آیئے پہلے انگریزی میں رابرٹ سکولز کے اس اقتباس پر غور کریں:

The last half of the nineteenth century and the last half of the twentieth were charecterized by the fragmentation of knowledge into isolated disciplines so

formidable in their specialization as to seem beyond all synthesis. Even philosophy, the queen of the human sciences, came down from her throne to -philosophy of Wittgenstein and play solitary word games. Both the language the existentialism of the Continental thinkers are philosophy of retreat......
(Scholes, Structuralism in Literature, New York, Vail-Ballou Press,1974, p,1)

گوپی چند نارنگ کے مندرجہ ذیل اقتباس کو دیکھئے:

''انیسویں صدی کے نصفِ آخر اور بیسویں صدی نصفِ اوّل میں فکرِ انسانی تخصیص کے مختلف میدانوں میں بٹ بٹا کر اس حد تک پارہ پارہ ہوگئی تھی کہ اس میں کسی طرح کی کوئی شیرازہ بندی ممکن نظر نہیں آتی تھی ۔اور تو اور خالص فلسفہ بھی جسے علومِ انسانیہ کا بادشاہ کہا جاتا ہے، وہ بھی لفظوں کے الگ تھلگ پڑ جانے والے کھیل میں لگ چکا تھا۔وٹگنسٹائن کا فلسفہ لسان ہو یا یورپی مفکرین کی وجودیت، اصلاً یہ سب مراجعت کے فلسفے ہیں۔۔(ص،۳۴)۔

برطانوی سوشل مفکر کرسٹوفر نورس لکھتے ہیں:

Derrida's professional training was as a student of philosophy (at the Ecol Normale Superieure in Paris, where he taught until recently), and his writings demand of the reader a considerable knowledge of the subject. Yet Derrida's texts are like nothing else in modern philosophy, and indeed represent a challenge to the whole tradition and self-understanding of that discipline.
Norris, Christopher. Deconstruction.3rd ed, London, Routledge,2002, P18-19)

نارنگ صاحب لکھتے ہیں:

''تربیت کے اعتبار سے بھی دریدا فلسفی ہے، اور اس وقت بھی وہ۔۔ Ecol Normale Superieure, Paris میں فلسفے کا استاد ہے۔نیز اس کی تحریروں کو فلسفے کی بنیادی باتوں کو جانے بغیر سمجھنا بھی ناممکن ہے۔تاہم دریدا کی تحریروں کو فلسفے میں شمار کرنا بھی مشکل ہے، اس لئے کہ فلسفے میں دریدا کی تحریروں کے مماثل کوئی چیز نہیں ملتی، کیونکہ وہ پوری فلسفیانہ روایت کو اور ان بنیادوں کو جن پر فلسفہ بحیثیت ضابطہ علم قائم ہے، چیلنج کرتا ہے'' **(نارنگ،ص ۲۱۷)**۔۔۔۔۔کرسٹوفر نورس لکھتے ہیں:

Derrida refuses to grant philosophy the kind of privileged status it has always claimed as the sovereign dispenser of reason. Derrida confronts this

pre-emptive claim on its own chosen grounds. He argues that philosophers have been able to impose their various systems of thought only by ignoring, suppressing, the disruptive effects of languages. His aim is always to draw out these effects by a critical reading which fastens on, and skilfully unpicks, the elements of metaphor and other figural devices at work in the texts of philosophy. Deconstruction in this, its most rigorous form acts as a constant reminder of the ways in which language deflects or complicates the philosophers project. Above all deconstruction works to undo the idea-according to Derrida, the ruling illusion of Western metaphysics- that reason can somehow dispense with language and achieve a knowledge ideally unaffected by such mere linguistic foibles. Norris, P18-19).
(

گوپی چند نارنگ کی کتاب کے اس اقتباس پر غور کریں:

''دریدا فلسفے کو بحیثیت ضابطہ علم یہ آمرانہ درجہ دینے کو تیار نہیں کہ فکرِ انسانی کے جملہ حقوق فلسفے کے نام محفوظ کر دیے جائیں ۔اس کا دعویٰ ہے کہ فلاسفہ اپنے نظام ہائے فکر کو مسلط کرنے کے لیے زبان کے داخلی تضادات کو دباتے ،پسِ پشت ڈالتے یا نظر انداز کرتے رہے ہیں۔دریدا اپنے ردِ تشکیلی مطالعات میں فلسفے کی ان کمزوریوں اور معذوریوں کو نمایاں کرتا ہے۔وہ بار بار نہایت سختی سے یاد دلاتا ہے کہ زبان کی نوعیت ایسی ہے کہ وہ فلسفی کے کام کو مشکل سے مشکل تر بناتی ہے۔ اگرچہ مغربی مابعدالطبیعات میں یہ خیال عام رہا ہے کہ فکر انسانی کسی نہ کسی طرح زبان سے چھٹکارہ پاسکتی ہے اور سچائی کو بیان کرنے کا کوئی خالص اور مستند طریقہ وضع کر سکتی ہے۔۔۔**(ص،۲۱۸۔۲۱۷)**

کرسٹوفر نورس سوشل فلاسفر ہونے کی حیثیت سے فلسفے کی اہمیت سے بخوبی آگاہ ہیں۔اس لئے وہ کوئی ایسا انتہا پسندی پر مبنی بیان جاری نہیں کرتے، جس سے فلسفے کی غیر ضروری تضحیک کی جائے۔مندرجہ بالا اقتباس میں جہاں پر انہوں نے ڈیکنسٹرکشن کے حوالے سے فلسفے کا ذکر کیا ہے ،وہاں پر انہوں نے واضح الفاظ میں ''دریدا کے مطابق'' لکھ دیا ہے۔نارنگ صاحب کی اگر اب تک کی تصانیف کا جائزہ لیا جائے تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ انہوں نے اپنے مضامین میں کسی بھی فلسفی کے افکار پر بحث نہیں اٹھائی۔اس کا یہ مطلب ہے کہ وہ فلسفے کے بارے میں کچھ نہیں جانتے، جو

ان کے اس اقتباس سے واضح ہے ''لیکن دریدا نا قابلِ تردید طور پر ثابت کرتا ہے کہ فلسفے کی یہ توقع واہمے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی، اور فلسفے کا زبان کے شکنجے سے آزاد ہونا قطعاً ناممکن ہے'' (ص ۲۱۸)۔

کرسٹوفر نورس لکھتے ہیں،

In this sense Derria's writings seem more akin to literary criticism than philosophy. They rest on the assumption that modes of rhetorical analysis, hitherto applied mainly to literary texts, are infact indispensable for reading any kind of discourse, philosophy included. Literature is no longer seen as a kind of poor relation to philosophy, contenting itself with mere fictive or illusory appearances and forgoing any claim to philosophic dignity and truth. This attitude has, of course, a long prehistory in Western tradition. It was plato who expelled the poets from his ideal republic, who set up reason as a guard against the false beguilements of rhetoric, and who called forth a series of critical 'defences' and 'apologise' which runs right through from Sir Philip Sydney to I. A. Richards and the Americans new critics. The lines of defence have been variously drawn up, according to whether the critic sees himself as contesting philosophy on its own argumentative ground, or as operating outside its reach on a different - though equally privileged - ground. (Norris,P19)

نارنگ صاحب اس اقتباس سے متاثر ہو کر کیا کمال دکھا رہے ہیں:

''اس نظر سے دیکھا جائے تو فلسفے سے زیادہ ادب کی ذیل میں آتی ہیں، اس کا بنیادی ایقان یہ ہے کہ لسانی یا بدیعی تجزیہ جو فقط ادبی متن کا منصب سمجھا جاتا ہے، وہ درحقیقت کسی بھی بیان (discourse) بشمول فلسفیانہ بیان کے سنجیدہ مطالعے کے لئے ضروری ہے۔ دریدا کا موقف ہے کہ ادب فلسفے کا دور کا رشتہ دار نہیں، جس کو فلسفی محض لفظوں کے تخیلی توتے مینا بنانے والے ضابطے کے طور پر رد کرتے رہے ہیں، بلکہ سچائی کا حصہ دار ہونے کے ناطے ادب اسی عزت و افتخار کا مستحق ہے جو فلسفے کے لئے مخصوص ہے۔ اتنی بات معلوم ہے کہ افلاطون نے ادیبوں، شاعروں کو اپنی مثالی ریاست سے اسی لئے خارج کر دیا تھا کہ عقل کے مقابلے میں ادب کی مجازیت قابلِ برداشت نہ تھی۔ سر فلپ سڈنی سے لے کر رچرڈز اور نئی تنقید تک ادب کی آزادانہ حیثیت کا دفاع

کیا جاتا رہا ہے۔۔۔۔'' (**نارنگ، ص، ۲۱۸**)۔

نارنگ صاحب نے یہاں پر نورس کے لفظ 'امریکی' کو حذف کر دیا ہے، کہیں اُردو والے امریکہ کے نام سے ناراض نہ ہو جائیں۔ اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے ڈسکورس کو انگریزی میں لکھ دیا ہے، جس سے یہ تاثر ابھرے کہ نارنگ صاحب خود یہ تجزیہ پیش کر رہے ہیں جہاں انہوں نے ضروری سمجھا انگریزی لفظ کا استعمال بھی کر دیا۔

راقم کا یہ دعویٰ ہے کہ گوپی چند نارنگ کی کتاب میں دریدا اور ردِ تشکیل پر لکھا ہوا تمام مواد کرسٹوفر نورس کی کتاب سے ہو بہو ترجمہ ہے۔ آیئے ایک اور اقتباس پر غور کریں۔ کرسٹوفر نورس لکھتے ہیں:

The counter-arguments to deconstruction have therefore been situated mostly on commonsense, or 'ordinary-language' ground. There is support from the philosopher Ludwig Wittgenstein (1889-1951) for the view that such sceptical philosophies of language rest on a false epitemology, one that seeks (and inevitably fails) to discover some logical correspondence between language and the world. Wittgenstein himself started out from such a position, but came round to believing that language had many uses and legitimating 'grammars', non of them reducible to a clear-cut logic of explanatory concepts. His later philosophy repudiates the notion that meaning must entail some one-to-one link or 'picturing' relationship between propositions and factual status of affairs. Languages now conceived of as a repertoire of 'games' or enabling conventions, as diverse in nature as the jobs they are require to do (Wittgenstein 1953). The nagging problems of philosophy most often resulted, Wittgenstein thought, from the failure to recognise multiplicity of language games. Philosophers looked for logical solutions to problems which were only created in the first place by a false conception of language, logic and truth. Scepticism he argued, was the upshot of a deluded quest for certainty in areas of meaning and interpretation that resist any such strictly regimented logical account. (Norris, P127-128).

نارنگ صاحب کی 'لسانیاتی چال' دیکھیں:

''دریدا کی ردِ تشکیل کے خلاف جتنی بھی بحث کی گئی ہے وہ عام زبان (ORDINARY-ANGUAGE) کے نکتۂ نظر سے کی گئی ہے۔ خاطر نشان رہے کہ ایسے لوگوں سے

پہلے لدوگ وٹگنسٹائن۔۔(LUDWIG WITTGENTEIN 1889 - 1951) کہہ چکا ہے کہ زبان سے متعلق متشککانہ نظریے اس جھوٹی علمیات (EPISTEMOLOGY) کا حصہ ہیں جو زبان اوراشیاء میں کسی نہ کسی طرح کا منطقی ربط پیدا کرنا چاہتی ہے۔وٹگنسٹائن نے خود اپنا فلسفیانہ سفر اسی تشکیک سے شروع کیا،لیکن بعد میں وہ اسی نتیجے پر پہنچا کے زبان کے کئی طرح کے استعمال ہیں، جن سے کئی طرح کی گرائمریں پیدا ہوتی ہیں، اور ان میں سے کوئی بھی گرائمر منطق کے صاف شفاف اصولوں کی سطح پرنہیں لائی جاسکتی۔وٹگنسٹائن کا فلسفہ اس بات کی تردید ہے کہ زبان میں لفظ اور شئے میں ایک اور ایک کا رابطہ ہے۔وہ زبان کا تصور ایک ایسے نظام کے طور پر کرتا ہے جس میں طرح طرح کے مقاصد کے لئے طرح طرح کے کھیل کھیلے جاتے ہیں وٹگنسٹائن کا کہنا ہے کہ فلسفے کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ زبان کی کثیر المعنیت کو زیرِ دام نہیں لاسکتا۔فلاسفہ کو مسائل کے منطقی حل کی ضرورت ہوتی ہے،اور تشکیک تیقن کی کھوج کا نتیجہ ہے کیونکہ معنی کی منطقی تحلیل ممکن نہیں۔غرض بقول وٹگنسٹائن وہ تمام متشککانہ فلسفے جو زبان ، منطق اور حقیقت کے درمیان مختلف النوع مطابقتوں کونہیں دیکھ سکتے، حیرت کا شکار ہونے پر مجبور ہیں۔'' **(نارنگ،ص،۲۱۹)۔**

اس سے قبل بھی یہ عرض کیا جاچکا ہے کہ نارنگ نے رامن سیلڈن کی کتاب Contemporary Literary Theory میں سے بہت زیادہ سرقہ یا ترجمہ (تسلیم کرنے کی صورت میں) کیا ہے۔ ہماری تحقیق کے مطابق نارنگ نے سیلڈن کی کتاب کا پہلا اور آخری باب چھوڑ کر تقریباً تمام کتاب کا ترجمہ کردیا ہے۔ایگلٹن ،جیمسن ، یاؤس اور رفارٹیئر وغیرہ پر لکھا گیا ایک ایک لفظ سیلڈن کی کتاب میں سے ترجمہ کیا گیا ہے۔ان ابواب پر نظر ڈالتے ہیں جو اس سے قبل کہیں بھی پیش نہیں کیے گئے۔اور پھر فیصلہ کرتے ہیں کہ یہ شخص سارق ہے یا مترجم؟ سیلڈن لکھتے ہیں۔

Eagleton, like Althusser, argues that criticism must break with its 'ideological prehistory' and become a 'science'. The central problem is to define the relationship between literature and ideology, because in his view texts do not reflect historical reality but rather work upon ideology to produce an effect of the 'real'. The text may appear to be free in its relation to reality (it can invent characters and situations at will), but it is not free in its use of ideology. 'Ideology' here refers not to formulated doctrines but to all those systems of

representations (aesthetic, religious, judicial and others) which shapes the individuals mental pictures of lived experience. The meanings and perceptions produced in the text are a reworking of ideologie's on working of reality. This means that the text works on reality at two removes. Eagleton goes on to deepen the theory by examining the complex layering of ideology from its most general pre-textual forms to the ideology of the text itself. He rejects Althusser's view that literature can distance itself from ideology; it is a complex reworking of already existing ideological discourses. However, the literary result is not merely a reflection of other ideological discourses but a special production of ideology. For this reason criticism is concerned not with just the laws of literary form or the theory of ideology but rather with 'the laws of the production of ideological discourses as literature'.

Eagleton surveys a sequence of novels from George Eliot to D.H Lawrence in order to demonstrate the interrelations between ideology and literary form.... Eagleton examines each writer's ideological situations and analyses the contradictions which develope in their thinking and the attempted resolutions of the contradictions in their writing. After the destruction of liberal humanism in the first world war Lawrence developed a dualistic pattern of 'female' and 'male' principles. This antithesis is developed and reshuffled in the various stages of his work, and finally resolves in the characterisation of mellors (Lady Chatterley's Lover) who combines impersonal 'male' power and 'female' tenderness. This contradictory combination, which takes various forms in the novels, can be related to a 'deep-seated ideological crises' within contemporary society.

The impact of poststructuralist thought produced a radical change in Eagleton's work in the late 1970s. His attention shifted from the 'scientific' attitude of Althusser towards the revolutionary thought of Brecht and Benjamine. This shift had the effect of throwing Eagleton back towards the classic Marxist revolutionary theory of the Thesis on Feuerbach (1845): 'The question whether objective truth can be attributed to human thinking is not a question of theory but is a practical question...The philosophers have only interpreted the world in various ways; the point is to change it'. Eagleton believes that 'deconstructive' theories, as developed by Derrida, Paul de Man and others can be used to undermine all certainties, all fixed and absolute forms of knowledge..............

Raman Seldon, Contemporary Literary Theory, 3rd ed, Britain, 1993,P, 92-93.

واضح رہے کہ سیلڈن کا ایگلٹن پر یہ مضمون ختم نہیں ہوا (ہم دیکھیں گے کہ نارنگ کا سرقہ بھی ختم نہیں ہوتا)، بلکہ سیلڈن کی کتاب میں صفحہ نمبر ۹۵ تک جاتا ہے۔ اس کے بعد سیلڈن نے جیمسن پر بحث کا آغاز کر دیا ہے۔ یہاں یہ نکتہ بھی ذہن نشیں رہے کہ ایگلٹن کے بارے میں جو کچھ لکھا گیا ہے یہ سیلڈن کا لکھا ہوا ہے۔ سیلڈن نے ایگلٹن کی کتابوں کا مطالعہ کیا اور قاری کے لیے چند صفحات پر ہی ''افہام وترسیل'' کو کو ممکن بنا دیا۔ ایسا لگتا ہے کہ نارنگ افہام وترسیل کا مطلب بھی نہیں جانتے۔ نارنگ کے انتہائی علمی وفکری سطح پر معذور حواری بھی نارنگ کا یہی اقتباس پیش کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ علمی بد دیانتی کے تسلسل نے علمی وادبی روح تک ان کے باطن میں پیدا نہیں ہونے دی۔ ایگلٹن کے حوالے سے نارنگ کے برعکس، یہ تجزیہ اور ''افہام وترسیل'' پروفیسر سیلڈن کی ہے۔ نارنگ کے لفظ بہ لفظ ترجمے کو قاری کے سامنے لانا ضروری ہے۔ نارنگ کا ''بے دھڑک'' ہونا ملاحظہ کریں

''التھیو سے سے اتفاق کرتے ہوئے ایگلٹن کہتا ہے کہ 'تنقید کے لیے ضروری ہے کہ وہ آئیڈیولاجیکل ماضی سے اپنا رشتہ منقطع کرے اور سائنس بن جائے' اصل مسئلہ ادب اور آئیڈیالوجی کے رشتے کا تعین ہے، کیونکہ ادب تاریخی حقیقت کا عکس پیش نہیں کرتا، بلکہ آئیڈیالوجی کے ساتھ عمل آرا ہو کر حقیقت کا اثر پیدا کرتا ہے۔ متن حقیقت سے اپنے رشتے میں آزاد ہے، وہ کرداروں اور صورتحال کو آزادانہ خلق کر سکتا ہے، لیکن آئیڈیالوجی سے اپنے رشتے میں آزاد نہیں۔ آئیڈیالوجی سے صرف وہ سیاسی تصورات اور اصول وضوابط مراد نہیں جن کا ہم شعور رکھتے ہیں، بلکہ بشمول جمالیات، الہیات، عدلیات، وہ تمام نظامات جن کی روح سے فرد 'جھیلے ہوئے تجربے' کا ذہنی تصور قائم کرتا ہے۔ متن کے ذریعے رونما ہونے والے معنی اور تصورات دراصل اس تصورِ حقیقت کا بازِ تصور ہوتے ہیں جنھیں آئیڈیالوجی نے قائم کیا ہے۔ اس طرح گویا متن میں حقیقت کا تصور دو طرح سے در آتا ہے۔ ایگلٹن متن سے پہلے کی اور بعد کی آئیڈیالوجی کی شکلوں اور ان کے پیچیدہ رشتوں کا تجزیہ کر کے اپنے نظریے میں مزید وسعت پیدا کرتا ہے۔ اس کا خیال ہے التھیو سے کا یہ کہنا مناسب نہیں کہ ادب آئیڈیالوجی سے فاصلہ پر ہوتا ہے۔ بقول ایگلٹن ادب تو

آئیڈیالوجی کے مباحث کی بازیافت ہوتا ہے۔ بہر حال نتیجتاً ادب آئیڈیالوجی کے مباحث کے عکس کے طور پر نہیں، بلکہ آئیڈیالوجی کی ایک خاص 'پیداوار' کے طور پر ظاہر ہوتا ہے۔ بس تنقید کا کام صرف ہیئت کے اصول وضوابط کا یا آئیڈیالوجی کا نظریاتی تعین نہیں، بلکہ ان قوانین کا طے کرنا بھی ہے، جن کی رو سے آئیڈیولاجیکل مباحث ادب کی 'پیداوار' میں ڈھلتے ہیں۔

ایگلٹن جارج ایلیٹ سے ڈی ایچ لارنس تک متعدد ناولوں کا مطالعہ کرتا ہے اور دکھاتا ہے کہ آئیڈیالوجی ادبی ہیئت میں کیا رشتہ ہے۔ ایگلٹن ہر مصنف کے آئیڈیولاجیکل موقف کا جائزہ لیتا ہے اور تجزیہ کر کے ان کے افکار کے تضادات کو ظاہر کرتا ہے، اور یہ کہ بالآخر ان تضادات کو حل کرنے کی کیا کوشش کی گئی۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد لارنس کے یہاں 'مردانہ' اصول اور 'نسوانی' اصول کی ثنویت ملتی ہے، بہر حال اس کا 'ردمقدمہ بھی رونما ہوتا ہے' اور کئی منزلوں سے گزرتے ہوئے بالآخر 'لیڈی چیٹر لیز لور' میں میلرز کے کردار میں حل کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ یعنی میلرز کا کردار غیر شخصی سطح پر 'مردانہ' قوت اور 'نسوانی' نرمی دونوں کا بیک وقت حامل ہے۔ بقول ایگلٹن اس طرح کے متضاد ارتباط اس اندرونی آئیڈیولاجیکل کرائسس کو ظاہر کرتے ہیں جس کا سماج شکار ہے۔

۱۹۷۰ کے بعد پسِ ساختیاتی فکر کے باعث ایگلٹن کے کام میں بنیادی تبدیلی یہ رونما ہوئی کہ اب اس کی توجہ التھیو سے کے سائنسی رویے سے ہٹ کر بریخت اور بینجمن کی انقلابی فکر پر مرکوز ہوگئی۔ نتیجتاً ایگلٹن مارکس کے کلاسیکی انقلابی نظریے Thesis on Feuerbach (1845).

''THE QUESTION WHETHER OBJECTIVE TRUTH CAN BE ATTRIBUTED TO HUMAN THINKING IS NOT A QUESTION OF THEORY BUT AIS A PRACTICAL QUESTION.... THE PHILOSOPHERS HAVE ONLY INTERPRETED THE WORLD IN VARIOUS WAYS; THE POINT IS TO CHANGE IT".

ایگلٹن کو اس سے اتفاق ہے کہ نظریہ ردتشکیل جس کو دریدا، پال دی مان اور دوسروں نے قائم کیا ہے، اس کو پہلے سے طے شدہ معنی کو بے دخل کرنے کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے'' (نارنگ، ۲۶۴۔۲۶۵)۔

واضح رہے کہ نارنگ کا سرقہ جاری ہے جو صرف ایگلٹن کی بحث میں ہی صفحہ نمبر ۲۶۷ تک چلا جاتا ہے۔ ''ساختیات پس ساختیات اور مشرقی شعریات'' کی کتاب دو کے پانچویں باب میں ''مارکسیت، ساختیات اور پس ساختیات'' کے عنوان سے ایگلٹن وغیرہ پر لکھا گیا تمام مواد لفظ بہ لفظ اٹھا لیا گیا ہے، وہاں پر صفحات کی کوئی تفصیل نہیں دی گئی۔ مصادر میں کتاب دو کے پانچویں باب کی تفصیل صفحہ ۳۳۲ پر دی گئی ہیں، وہاں پر بھی صفحات کی تفصیل موجود نہیں ہے۔ گوپی چند نارنگ نے اپنے انٹرویو میں کہا ہے کہ ''جہاں ضروری تھا وہاں تلخیص اور ترجمہ بھی کیا ہے۔ بات کا زور بنائے رکھنے کے لئے اصل کے Quotations بھی جگہ جگہ دیے ہیں۔'' مذکورہ بالا اقتباس پر توجہ مرکوز کرنے سے واضح ہو جاتا ہے کہ نارنگ نے تمام و کمال اس کو سیلڈن کی کتاب سے ترجمہ کر دیا ہے، مگر اس اقتباس میں ایک Quotation انگریزی میں دی گئی ہے، جس سے یہ تاثر قائم کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ صرف یہی ایک اقتباس کسی دوسرے مصنف سے ماخوذ ہے، نارنگ نے انٹرویو میں کہا ہے کہ جہاں ضرورت محسوس کی گئی وہاں ''بات کا زور بنائے'' رکھنے کے لیے Quotation پیش کیے گئے ہیں، جبکہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ اس انداز میں Quotation کا استعمال بات کا 'زور بنائے رکھنے' کے لیے نہیں، بلکہ ذہنی طور پر اپاہج حواریوں میں 'اپنا زور بنائے' رکھنے کی کوشش ہے، جس میں ان کو خاطر خواہ کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ مذکورہ بالا اقتباس سے ایسا لگتا ہے کہ اردو میں لکھا گیا ہر لفظ نارنگ کا تجزیہ ہے، یہ کہنا ادبی مفہوم میں کسی گناہِ کبیرہ کا ارتکاب کرنے کے مترادف ہوگا۔

اس کے بعد پروفیسر سیلڈن نے جیمسن پر مختصر بحث کی ہے، اس کو بھی نارنگ نے جوں کا توں اٹھا لیا ہے۔ جوں کا توں اٹھانے کا مطلب یہ ہوا کہ ایگلٹن ہی کی طرح نارنگ نے جیمسن کی بھی کسی کتاب کا مطالعہ نہیں کیا، سیلڈن جیمسن کے حوالے سے بھی مغربی طالب علم کو آسان الفاظ میں سمجھانے کے لیے جو تعارف پیش کرتے ہیں، نارنگ اس کو لفظ بہ لفظ اٹھا کر سیلڈن کی افہام و ترسیل کو ایک بار پھر اپنی ''افہام و ترسیل'' بنا کر پیش کرتے ہیں۔ پہلے سیلڈن کی جانب چلتے ہیں:

In America, where the labour movement has been partially corrupted and totally excluded from political power, the appearance of a major Marxist

theorist is an important event. Jameson believes that in the post-industrial world of monopoly capitalism the only kind of Marxism which has any purchase on the situation which explores the 'great themes of Hegel's philosophy - the relationship of part to whole, the opposition between concrete and the abstract, the concept of totality, the dialectic of appearance and essence, the interaction between subject and object'. For dialectical thought there are no fixed and unchanging 'objects'; an 'object' is inextricably bound up with a larger whole, and is also related to a thinking mind which is itself part of a historical situation. Dialectical criticism does not isolate individual literary works for analysis; an individual is always a part of a larger structure (a tradition or a movement) or part of a historical situation. The dialectical critic has no pre-set categories to apply to literature and will always be aware that his or her chosen categories (style, character, image, etc.) must be understood ultimately as an aspect of the critics on historical situation........ A Marxist dialectical criticism will always recognise the historical origins of its own concepts and will never allow the concepts to ossify and become insensitive to the pressure of reality. We can never get outside our subjective existence in time, but we can try to break through the hardening shell of our ideas 'into a more vived apprehension of reality itself'.

His The Political Unconscious (1981) retains the earlier dialectical conceptio of theory but also assimilates various conflicting traditions of thought (structuralism, poststructuralism, Freud, Althusser, Adorno) in an impressive and still recognisably Marxist synthesis. Jameson argues that the fragmented and alienated condition of human society implies an original state of primitive communism in which both life and perception were collective.............. All ideologies are 'strategies of containment' which allow society to provide an explaination of itself which suppresses the underlying contradiction of history; it is history itself (the brute reality of economic Necessity) which imposes this strategy of repression. Literary texts work in the same way: the solutions which they offer are merely symptoms of the suppression of history. Jameson cleverly uses A.J Greimas' structuralist theory (the 'semiotic rectangle') as an analytic tool for his own purposes. Textual strategies of containment present themselves as formal patterns. Greimas' structuralist system provide a complete inventry of possible human relations... which when applied to a text's strategies, will allow the analyst to discover the posibilities which are not said. This 'not said' is the represses history.

Jameson also developes a powerful argument about narrative and interpretation. He believes that narrative is not just a literary form or mode but an essential 'epistemological category'; reality presents itself to the human mind only in the form of the story. Even a scientific theory is a form of story. (Seldon, P, 95-97).

نارنگ کی کتاب کا مطالعہ کرتے ہیں،

''امریکہ میں فریڈرک جیمیسن جیسے اہم مارکسی نظریہ ساز کا پیدا ہونا خاصا دلچسپ ہے۔۔۔۔جیمسن کا خیال ہے کہ 'پس صنعتی' دنیا میں جہاں اجارہ دارانہ سرمایہ داری کا دور دورہ ہے، مارکسزم کی صرف وہی قسم کامیاب ہوسکتی ہے جو ہیگل کے فلسفے کی عظیم تھیم سے جڑی ہوئی ہو، یعنی جز کا کل سے مربوط ہونا، ٹھوس اور مجرد کا متضاد ہونا، کلیت کا تصور، ظاہری شکل اور اصل میں جدلیانہ کشمکش اور موضوع اور معروض کا عمل در عمل، وغیرہ۔ بقول جیمسن جدلیاتی فکر میں کوئی مقررہ اور تغیر نا آشنا معروض نہیں ہے، اور ہر معروض ایک بڑے کل سے ناقابل شکست طور پر جڑا ہوا ہے، اور سوچنے والے ذہن سے جو خود تاریخی صورتحال سے جڑا ہوتا ہے۔ جدلیاتی تنقید انفرادی فن پاروں کا الگ الگ تجزیہ نہیں کرتی، کیونکہ فرداً ایک وسیع تر بڑی ساخت کا حصہ ہے جو ایک روایت یا تحریک بھی ہوسکتی ہے ۔ سچا جدلیاتی نقاد ادب پر پہلے سے طے شدہ زمروں کا اطلاق نہیں کرتا، وہ اس بات کا بھی لحاظ کرتا ہے کہ خود اس کے منتخب کردہ زمرے مثلاً اسلوب، کردار، امیج وغیرہ بالآخر خود اس کی تاریخی صورتحال کا جُز ہیں۔ مارکسی جدلیاتی تنقید کو ہمیشہ اپنے تاریخی مآخذ کا احساس ہونا چاہیے اور تصورات کو ہرگز جامد نہ ہونے دینا چاہیے تاکہ حقیقت کا صحیح ادراک ممکن ہو۔ بے شک ہم زماں کے اندر اپنی موضوعی حالت سے باہر نہیں آسکتے، لیکن خیالات کے سخت ہوتے ہوئے خول کو توڑ سکتے ہیں تاکہ حقیقت کی بہتر طور پر تفہیم کرسکیں۔

جیمسن کی کتاب THE POLITICAL UNCONSCIOUS, (1981) میں جدلیاتی فکر کے تسلسل کے ساتھ متعدد متضاد عناصر کو سمونے کا عمل ملتا ہے، مثلاً ساختیات، پسِ ساختیات نو فرائیڈیت، التھیو سے ادورنو وغیرہ۔ جیمسن کا کہنا ہے کہ موجودہ سماج کی پارہ پارہ اور اجنبیانہ حالت میں قدیم زمانے کی اشتراکی زندگی کا تصور مضمر ہے، جس میں زیست اور تصورات سب ملے جلے

اور اجتماعی نوعیت کے تھے، جیمسن کا یہ بھی خیال ہے کہ تمام آئیڈیالوجی اقتدار حاصل کرنے اور قابو میں رکھنے (CONTAINMENT) کے طور طریقوں کی شکل ہے جو سماج کو اس بات کا موقع دیتی ہے کہ تاریخ کے تہہ نشیں تضادات کو دبایا جاسکے۔ اور لطف کی بات یہ ہے کہ تاریخ جو ''اقتصادی ضرورت کی وحشی حقیقت ہے''

"THE BRUTE REALITY OF ECONOMIC NECESSITY"

جبر کے ان طور طریقوں کو خود ہی مسلط کرتی ہے۔ ادبی متن بھی اسی طرح عمل آرا ہوتا ہے، کیونکہ بالعموم متن جو حل پیش کرتا ہے، وہ خود تاریخ کے جبر کی علامت ہوتا ہے۔ جیمسن نے ساختیاتی مفکر گریما کے نشانیاتی مثلث کو اپنے مقاصد کے لیے کامیابی سے برتا ہے۔ تاریخی جبر کے طور طریقے ہیئتی نمونوں میں ظاہر ہوتے ہیں۔ گریما کا ساختیاتی نظام ممکنہ انسانی رشتوں کے گوشواروں پر مبنی ہے۔ اسے اگر متون پر آزمایا جائے تو وہ مقامات ظاہر ہوجاتے ہیں جو نہیں کہے گئے۔ یہ نہ کہے گئے مقامات وہ تاریخ ہیں جو دبادی گئی۔

جیمسن نے بیانیہ اور اس کی توضیح کے بارے میں بڑی کارآمد بحث کی ہے۔ اس کا خیال ہے کہ بیانیہ محض ایک ادبی فارم یا طور نہیں ہے بلکہ ایک 'علمیاتی زمرہ' (EPISTEMOLOGICAL CATEGORY) ہے، اس لیے کہ حقیقت قابلِ فہم ہونے کے لیے خود اپنے آپ کو کہانی کے فارم میں پیش کرتی ہے۔ اور تو اور ایک سائنسی نظریہ بھی کہانی ہوسکتا ہے'' (۲۶۹۔۲۶۷)۔

نارنگ کا یہ اقتباس یہیں پر ختم نہیں ہوتا۔ اگر قاری کو توفیق ہو تو اسی تسلسل میں دونوں کتابوں کو سامنے رکھتے ہوئے مطالعہ جاری رکھنے سے یہ انکشاف ہوجائے گا کہ لفظ بہ لفظ ترجمے کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ گو کہ نارنگ انتہائی عیاری سے مختلف پیراگرافوں کو لفظ بہ لفظ ترجمہ کرنے کے باوجود ان کی ترتیب بدلنے کی کوشش کرتے ہیں، لیکن راقم نے مسروقہ مواد کی شناخت کو آسان کرنے کے لیے تسلسل کو ختم نہیں ہونے دیا۔ مثال کے طور پر نارنگ پہلے ایک صفحے کا ترجمہ کرتے ہیں اس کے بعد اگلے صفحے سے ایک پیراگراف اٹھا کر دوبارہ پہلے صفحے سے ترجمے کو جاری رکھتے ہیں۔ یقیناً اس طرح کے سرقے کو گرفت میں لانا آسان نہیں ہوتا، کیونکہ عام قاری جب دیکھتا

ہے کہ دو فقرے لفظ بہ لفظ ترجمہ ہیں، لیکن اس کے بعد آٹھ فقرے چھوڑ دیے گئے ہیں، تو وہ سوچ سکتا ہے کہ شاید یہی دو فقرے ترجمہ ہیں اور ان کا حوالہ غلطی سے نہیں دیا گیا۔ اس کے ذہن میں یہ نکتہ آ سکتا ہے کہ اس کے بعد اس صفحے سے کوئی اور پیراگراف نہیں اٹھایا گیا تو وہ سرقے کے پہلو کو نظر انداز کر سکتا ہے۔ دلچسپ نکتہ یہ ہے کہ نارنگ دوبارہ پہلے صفحے کی جانب پلٹتے ہیں، اور تمام و کمال ترجمہ کر کے قاری کو احمق بنانے کی بھرپور کوشش کرتے ہیں۔ قاری کو پیچیدگی سے محفوظ رکھنے کے لیے، راقم نے یہ کوشش کی ہے کہ نارنگ کی کتاب اور دیگر ترجمہ شدہ کتابوں میں تسلسل کو قائم رکھا جائے۔ اوپر والے اقتباس میں دیکھیں کہ کس طرح نارنگ نے اردو میں انگریزی کا حوالہ استعمال کیا ہے اور اسے واوین میں لکھ دیا ہے۔ گو کہ اس انگریزی اقتباس کا صفحہ نمبر نہیں دیا گیا۔ چونکہ یہ واضح ہے اس لیے اعتراض کی گنجائش نہیں ہے، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ پورا اقتباس جو یہاں پیش کیا گیا ہے، اور اس باب میں جس دیگر مواد کی نشاندہی کی گئی ہے اس کا حوالہ کہیں نہیں ہے۔ ایمانداری کا تقاضا تو یہی تھا کہ مکمل باب ہی واوین میں رکھا جاتا، لیکن اس کے لیے خود کو صرف مترجم کی حد تک ہی ظاہر کیا جا سکتا تھا جو نارنگ کو گوارہ نہ ہو سکا۔

ایک بار پھر رامن سیلڈن کی کتاب کے اس باب کا مطالعہ کرنا ہوگا جو نارنگ کے سرقے کی بھینٹ چڑھا ہے۔ آئیں یاؤس پر لکھے گئے باب پر غور کرتے ہیں، سیلڈن کے الفاظ ملاحظہ کریں،

Jauss, an important German exponant of "reception" theory, gave a historical dimension to reader-oriented criticism. He tries to achieve a compromise between Russian Formalism which ignores history, and social theories which ignores the text. Writing during a period of social unrest at the end of the 1960, Jauss and others wanted to question the old canon of German literature and to show that it was perfectly reasonable to do so.... He borrows from the philosophy of science (T.S Kuhn) the term "paradigm" which refers to the scientific framework of concepts and assumptions operating in a particular period. "Ordinary science" does its experimental work within the mental world of a particular paradigm, until a new paradigm displaces the old one and throws up new problems and establishes new assumptions. Jauss uses the term "horizon of expectations" to describe the criteria readers use to judge literary texts in any given period.... For example, if we consider the English Augustan

period, we might say that Popes's poetry was judged according to criteria, naturalness, and stylistic decorum (the words should be adjusted according to the dignity of the subject) which were based upon values of Popes's poetry. However this does not establish once and for all the value of Pope's poetry. During the second half of the eighteenth century, commentators began to question whether Pope was a poet at all and to suggest that he was a clever versifies who put prose into ryrhyming couplets and lacked the imaginative power required of true poetry. Leapfrogging the ninteenth century, we can say that modern readings of Pope work within a changed horizon of expectations: we now often value his poems for their wit, complexity, moral insight and their renewal of literary tradition.

In Jauss's view it would be equally wrong to say that a work is universal, that its meaning is fixed forever and open to all readers in any period: 'A literary work is not an object which stands by itself and which offers the same face to each reader in each period. It is not a monument which reveals its timeless essence in a monologue.' This means, of course, that we will never be able to survey the successive horizons which flow from the time of a work down to the present day and then, with an Olympian detachment. to sum up the works final value or meaning. To do so would be to ignore the historical situation. Whose authority are we to accept? That of the readers? The combined opinion of readers over time? (Raman Seldon. P,52-53).

اس اقتباس کے بعد پروفیسر سیلڈن ولیمز بلیک کی مثال دینے لگتے ہیں اور نارنگ بھی اپنے سرقے کا کام جاری رکھتے ہیں، آئیں نارنگ کے مجرمانہ فعل کو دیکھتے ہیں،

''روبرٹ یاؤس نے نظریہ قبولیت کے ذریعے 'قاری اساس تنقید' کو تاریخی جہت عطا کی ہے۔ یاؤس نے روسی ہیئت پسندی (جس نے بڑی حد تک تاریخ کو نظر انداز کیا تھا) اور سماجی نظریوں میں (جو متن کو نظر انداز کرتے ہیں) ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔۔۔۱۹۶۰ میں جب جرمنی میں اضطراب کا دور تھا۔ یاؤس اور اس کے ساتھیوں نے جرمن ادب کو پھر سے کھنگالا، اور جرمن ادبی روایت پر نئی نظر ڈالنے کی ضرورت پر زور دیا۔ یاؤس کی اصطلاح 'زمرہ' (PARADIGM) دراصل سائنس کے فلسفی ٹی ایس کوہن سے مستعار ہے اس سے یاؤس تصورات اور معروضات کا وہ مجموعہ مراد لیتا ہے جو کسی بھی عہد میں کارفرما ہوتا ہے۔ سائنس میں ہمیشہ تجرباتی

کام کسی ایک خاص 'زمرے' کی ذہنی دنیا میں انجام پاتا رہتا ہے حتٰی کہ تصورات کا کوئی دوسرا 'زمرہ' پہلے 'زمرے' کو بے دخل کر دیتا ہے، اوراس طرح نئے تصورات اور نئے مفروضات قائم ہو جاتے ہیں۔ کسی بھی عہد کے قارئین متن کی پرکھ کے لیے جن قوانین کا استعمال کرتے ہیں، یاؤس ان کے لیے 'افق اور توقعات' (HORIZON AND EXPECTATIONS) کی اصطلاحیں استعمال کرتا ہے جو 'زمرے' کے سائنسی تصور پر مبنی ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ مثال کے طور پر اگر ہم انگریزی شاعری کے آگسٹن دور پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ پوپ کی شاعری اس وقت کے ادبی افق اور توقعات کے عین مطابق تھی۔ چنانچہ اس وقت اس کی سلاست و قدرت، شائستگی اور شکوہ، اور اس کے خیالات کے فطرت کے مطابق ہونے کی داد دی گئی۔ تاہم اس زمانے کے ادبی افق اور توقعات کی رو سے پوپ کی شاعری کی قدر و قیمت ہمیشہ کے لیے طے نہیں ہوگئی۔ چنانچہ اٹھارویں صدی کے نصف دوئم کی انگریزی تنقید میں اکثر یہ سوال اٹھایا جانے لگا کہ کیا پوپ واقعی شاعر تھا، یا وہ محض ایک قادر الکلام ناظم تھا جس نے نظم میں قافیے ڈال کر اسے منظوم کر دیا۔ سچی شاعری کے لیے جو تخیل شرط ہے، کیا وہ پوپ کے یہاں ہے یا نہیں۔ بیسویں صدی میں اس بارے میں پھر تبدیلی ہوئی۔ ادھر دیکھیں تو پوپ کی جدید قرائتیں ایک بدلے ہوئے ذہنی افق اور دوسری طرح کی توقعات کے ساتھ ملتی ہیں۔ آج کل پوپ کی شاعری کو ایک ہی رنگ میں دیکھا جا رہا ہے۔ یعنی صناعی کے علاوہ اس میں مزاح، اخلاقی بصیرت اور روایت کی علم برداریت، یہ سب خوبیاں تلاش کر لی گئی ہیں، اور قدر کی نگاہوں سے دیکھی جانے لگی ہیں" (نارنگ، ص ۳۰۴۔۳۰۳)۔

نارنگ کا سرقہ ابھی جاری ہے، صرف صفحہ تبدیل کرنے سے عیاں ہو جاتا ہے۔ توجہ فرمائیں، اور اس کے بعد نارنگ کی تعریفوں کے پل باندھنے کی بجائے اس حرکت کو حقارت کی نظر سے دیکھنے کی اخلاقی و ادبی جرأت پیدا کریں۔ سیلڈن کا پیراگراف وہی ہے جو اوپر پیش کیا گیا ہے۔ نارنگ کا سرقہ اسی کا تسلسل ہے۔

"یاؤس کہتا ہے کہ یہ سوچنا غلط ہے کہ کوئی بھی فن پارہ تمام زمانوں کے لیے ہے یا آفاقی ہے، یا اس کے جو معنی خود اس کے زمانے میں متعین ہو گئے، وہی معنی ہر عہد میں قاری پر واجب ہیں۔

ادبی فن پارہ ایسی چیز نہیں جو قائم بالذات ہو، اور جو ہر عہد میں قاری کو ایک ہی چہرہ دکھاتا ہو۔ بقول یاؤس فن پارہ کوئی یادگار تاریخی عمارت نہیں، جو تمام زمانوں سے ایک ہی زبان میں بات کرے گی۔ گویا ادب کی دنیا میں ہم کسی ایسے 'افق اور توقعات' کا تصور قائم نہیں کر سکتے جو سب زمانوں کے لیے ہو۔ ایسا کرنا تاریخی حالت کو نظر انداز کرنا ہوگا۔ یعنی ہم کس کو صحیح مانیں، سابقہ قارئین کی رائے کو، یا مابعد کے قارئین کی رائے کو، یا خود اپنے دور کی قارئین کی رائے کو" (نارنگ ،ص ۳۰۶۔۳۰۵)۔ اس کے بعد ولیمز بلیک کے ذکر سے نارنگ نے سرقہ جاری رکھا ہوا ہے۔ واضح رہے کہ کہیں بھی صفحہ نمبر نہیں دیا گیا۔ ایک بار پھر رامن سیلڈن کی جانب چلتے ہیں،

The French semiotician Michael Riffaterre agrees with the Russian Formalists in regarding poetry as a special use of language. Ordinary language is practical and is used to refer to some sort of 'reality', while poetic language focuses on the message as an end in itself. He takes this formalist view from Jakobson, but in a well-known essay he attacks Jakobson's and Levi-Strauss's interpretation of Baudelaire's 'Les Chats'. Riffaterre shows that the linguistic features they discover in the poem could not possibly be perceived even by an in formed reader. All manner of grammatical and phonemic patterns are thrown up by their structuralist approach, but not all the features they note can be part of the poetic structure for the reader.

However, Riffaterre has some difficulty in explainig why something perceived by Jakobson does not count as evidence of what readers perceive in a text. Riffaterre developed his theory in Semiotics of Poetry (1978), in which he argues that competent readers go beyond surface meaning. If we regard a poem as a string of statements, we are limiting our attention to its 'meaning', which is merely what it can be said to represent in units of information. If we attend only to a poem's 'meaning' we reduce it to a (possibly nonsensical) string of unrelated bits. A true response starts by noticing that the elements (signs) in a poem often appear to depart from normal grammar or normal representation: the poem seemes to be establishing significance only indirectly
and in doing so ' threatens the literary representation of realty'. It requires only ordinary linguistic competence to understand the poem's 'meaning', but the reader requires'literary competence' to deal with the frequent ' ungrammaticalities' encountered in reading a poem. Faced with the

stumbling-block of ungrammaticalness the reader is forced, during the process of reading, to uncover a second (higher) level of significance which will explain the grammatical features of the text. What will ultimately be uncovered is a strcutural 'matrix', which can be reduced to a single sentence or even a single word. The matrix can be deduced only indirectly and is not actually present as a word or statement in the poem. The poem is conected to its matrix by actual versions of the matrix in the form of familiar statements, cliches, quotations, or conventional associations. it is the matrix which ultimately gives a poem unity. this reading process can be summarised as follows:

1. Try to read it for ordinary 'meaning':
2. Highlight those elements which appear umgrammatical and which obstruct on ordinary mimetic interpretation:
3. Discover the 'hypograms' (or commonplaces) which receive expanded or unfamiliar expression in the text;
4. Derive the 'matrix' from the ' hypograms'; that is, find a single statement or word capable of generating the ' hypograms' and the text.

(Seldon, P,60-61).

نارنگ کے سرقے کی جانب چلتے ہیں،

''مائیکل رفاٹیر شعری زبان کے بارے میں روسی ہئیت پسندوں کا ہم نوا ہے کہ شاعری زبان کا خاص استعمال ہے۔ عام زبان اظہار کے عملی پہلو پر مبنی ہے، اور کسی نہ کسی حقیقت (REALTY) کو پیش کرتی ہے، جبکہ شعری زبان اس 'اطلاع' پر مبنی ہے جو ہئیت کا حصہ ہے اور مقصود بالذّات ہے۔ ظاہر ہے اس معروضی ہئیتی رویے میں رفاٹیر، رومن جیکبسن سے متاثر ہے، لیکن وہ جیکبسن کے ان نتائج سے متفق نہیں جو جیکبسن اور لیوی سٹراس نے بودلئیر کے سانٹ Les Chat کے تجزیے میں پیش کیے تھے۔ ریفاٹیر کہتا ہے کہ وہ لسانی خصائص جن کا ذکر جیکبسن اور سٹراس کرتے ہیں، وہ کسی عام 'باصلاحیت قاری' کے بس کے نہیں۔ ان دونوں نے اپنے ساختیاتی مطالعے میں جس طرح کے لفظیاتی اور صوتیاتی نمونوں کا ذکر کیا ہے، یہ خصائص کسی بھی 'جانکار قاری' کی ذہنی صلاحیت کا حصہ نہیں ہو سکتے۔ ایک تربیت یافتہ قاری سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ متن کو اس خاص طریقے سے پڑھے۔ تاہم رفاٹیر یہ بتانے سے قاصر ہے کہ جیکبسن کا مطالعہ اس بات کی شہادت کیوں

فراہم نہیں کرتا کہ قاری متن کا تصوّر کس طرح کرتا ہے۔ رفاٹیر کے نظریے کی تشکیل اس کی کتاب: (1978) semiotics of poetry میں ملتی ہے۔ اس میں رفاٹیر نے اس مسئلے پر روشنی ڈالی ہے کہ باصلاحیت قاری متن کی سطح پر پیدا ہونے والے معنی سے آگے جاتا ہے۔ اگر ہم نظم کو محض معلومات کا مجموعہ سمجھتے ہیں تو ہم صرف اس معنی تک پہنچ پائے ہیں جو معلومات سے متعلق ہیں۔ ایک صحیح قرات ان نشانات (signs) پر توجہ کرنے سے شروع ہوتی ہیں جو عام گرامر یا عام معنی کی ترجمانی سے ہٹے ہوئے ہوں۔ شاعری میں معنی خیزی بالواسطہ طور پر عمل آرا ہوتی ہے، اور اس طرح وہ حقیقت کی لغوی ترجمانی سے گریز کرتی ہے، متن کی سطح پر کے معنی جاننے کے لیے معمولی لسانی اہلیت کافی ہے، لیکن ادبی اظہار کے رموز و نکات اور عام گرامر سے گریز کو سمجھنے اور اس کی تحسین کاری کے لیے خاص طرح کی اَدبی اہلیت شرط ہے۔ ایسے لسانی خصائص جن میں استعمالِ عام سے انحراف کیا گیا ہو، قاری کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ معنی خیزی کی داخلی سطح کو بھی دیکھے، جہاں اظہار کے اجنبی خصائص معنی سے روشن ہو جاتے ہیں۔ نیز ان تمام مقامات پر بھی نگاہ رکھے جن میں زبان و بیان کے بعض خصائص کی تکرار ہوئی ہے۔ ریفاٹیر اسے نظم کا ساختیاتی MATRIX کہتا ہے جسے مختصر کر کے ایک کلمے یا ایک لفظ میں بھی سمیٹا جا سکتا ہے۔ ضروری نہیں کہ MATRIX ایک کلمے یا ترکیب کی صورت میں نظم میں موجود ہو، چنا چہ اس کو متن سے اخذ کر سکتے ہیں۔ نظم اپنے ظاہری MATRIX کے ذریعے داخلی MATRIX سے جڑی ہوتی ہے۔ ظاہری MATRIX بالعموم جانے پہچانے بیانات، کلیشے، یا عمومی تلازمات اور مناسبات سے بُنا ہوتا ہے۔ نظم کی وحدت اس کے داخلی MATRIX کی دین ہے۔۔۔۔

۱۔ سب سے پہلے متن کو عام معنی کے لیے پڑھنا چاہیے۔

۲۔ پھر ان عناصر کو نشان زد کرنا چاہیے، جن میں زبان کے عام گرامری چلن سے گریز ہے، اور جو حقیقت کی عام ترجمانی کی راہ میں رکاوٹ بنتے ہیں۔

۳۔ اس کے بعد ان عام اظہارات پر نظر رکھی جائے جن کو متن میں اجنبیایا گیا ہے۔

۴۔ آخراً ان تمام اظہارات سے داخلی Matrix اخذ کیا جائے، یعنی وہ کلیدی کلمہ یا لفظ یا ترکیب جو

تمام اظہارات یا متن کو خلق generate کرتی ہو'' (نارنگ، ص، ۳۱۸۔۳۱۶)۔

The notion of 'structure', he argues, even in 'structuralist' theory has always presupposed a 'centre' of meaning of some sort. This 'centre' governs the structure but is itself not subject to structural analysis (to find the structure of the centre would be to find another centre). People desire a centre because it guarantees being as presence. For example, we think of our mental and physical life as centred on an 'I'; this personality is the principle of unity which underlies the structure of all that goes on in this space. Freud's theories completely undermine this metaphysical certainty by revealing a division in the self between conscious and unconscious. Western thought has developed innumerable terms which operate as centring principles: being, essence, substance, truth, form, begining, end, purpose, consciousness, man, God, and so on. It is important to not that Derrida does not assert the possibility of the thinking outside such term; any attempt to undo a particular concept is to become caught up in the terms which the concept depends on. For example if we try to undo the centring concept of consciousness by asserting the disruptive counter force of the 'unconscious', we are in danger of introducing a new centre, because we can not choose but enter the conceptual system (conscious/unconscious) we are trying to dislodge. All we can do is to refused to allow either pole in a system (body/soul, good/bad, serious/unserious) to become the centre and guarantor of presence. This desire for a centre is called 'Logocentrism' in Derrida's classical work Of Grammatology. 'Logos' (Greek for 'word') is a term which in the New Testament carries the greatest possible concentration of presence: ' In the begning was the word'......... Phonocentrism treats writing as a contaminated form of speech. Speech seems nearer to originating thought. When we hear speech we attribute to it a presence which we take to be lacking in writing. The speech of the great actor, orator, or politician is thought to posses presence; it incarnates, so to speak, the speaker's soul. Writing seems relatively impure and obtrudes its own system in physical marks which have a relative permanence; writing can be repeated (printed, reprinted, and so on) and this repition invites interpretation and reinterpretation. Even when a speech is subjected to interpretation it is usually in written form. Writing does not need the writer's presence, but speech always implies an immediate presence. The sounds made by a speaker evaporate in the air and leave no trace (unless recorded), and therefore do not appear to contaminate the originating thought as in writing. Philosophers have often expressed there dislike of writing; they fear that it will destroy the authority of philosophic truth. This Truth depends upon pure thought (logic, ideas, propositions) which risk contamination when written. Francis bacon .... (Seldon, 144-145).

اس وقت ضروری یہ ہے کہ نارنگ کے سرقے کی نشاندہی کی جائے:

''ساختیات سے بحث کرتے ہوئے دریدا کہتا ہے کہ ساختیاتی فکر میں ساخت (سٹرکچر) کا تصور اس مفروضے پر قائم ہے کہ معنی کا کسی نہ کسی طرح کا مرکز (Centre) ہوتا ہے۔ یہ مرکز ساخت کو اپنے تابع رکھتا ہے، لیکن خود اس مرکز کو تجزیے کے تابع نہیں لایا جاسکتا (ساخت کے مرکز کی نشاندہی کا مطلب ہوگا دوسرا مرکز تلاش کرنا) انسان ہمیشہ مرکز کی خواہش کرتا ہے اس لیے کہ مرکز 'موجودگی' کی ضمانت ہے:

CENTRE GUARANTEES BEING AS PRESENCE مثال کے طور پر ہم اپنی ذہنی اور جسمانی زندگی کو مرکزیت عطا کرتے ہیں ضمیر 'میں' کے استعمال سے ضمیر 'میں' یا 'ہم' کی اہمیت کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ فرض کیجیے زبان میں ضمیر 'میں' یا 'ہم' نہ ہوں تو ہم اپنی 'موجودگی' کا اثبات کیسے کریں گے۔ الغرض 'موجودگی' اس وحدت کا اصول ہے جو دنیا کی تمام سرگرمیوں کی ساخت کی تہہ میں کارفرما ہے۔ دریدا کا کہنا ہے کہ فرائڈ نے شعور اور لاشعور کی تقسیم کو بے نقاب کر کے وجود کی وحدت کے مابعد الطبیعاتی اعتقاد کی جڑ کھوکھلی کر دی۔ غور سے دیکھا جائے تو فلسفے کی بنیاد ہی ایسے تصورات پر ہے جو معنی کو 'مرکز' عطا کرنے کے اصول پر قائم ہے، مثلاً خدا، انسان، وجود، وحدت، 'شعور'، حق، خیر، شر، جوہر، اصل۔ دریدا یہ دعوٰی نہیں کرتا کہ ان اصطلاحات سے باہر ہو کر سوچنا ممکن ہے۔ بلکہ یہ اصطلاحات معنی کے جس 'مرکز' پر قائم ہیں، وہ ان میں نہیں ہے۔ فرض کیجیے کہ اگر یہ بھی کہیں کہ یہ تصورات قائم بالذات نہیں ہیں، بلکہ قائم بالغیر ہیں تو معنی کا مرکز 'غیر' میں بھی نہیں ہے۔ 'غیر' کو مرکز تسلیم کرنے کا مطلب ہوگا پھر سے اصطلاحوں میں گرفتار ہونا یا نیا مرکز تسلیم کرنا کیونکہ 'غیر' بھی تو قائم بالذات نہیں ہے۔ مثلاً اگر 'شعور' کے مرکز کو یہ کہہ کر ختم کیا جائے کہ لاشعور کی تخریبی قوت انسانی شخصیت میں ایک رد کرنے والے معمل کے طور پر کارفرما رہتی ہے، تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم ایک نئے مرکز کو تسلیم کر رہے ہیں، کیونکہ تصور کے جس نظام (شعور/لاشعور) کو ہم بے دخل UNDO کر رہے ہیں۔ اس سے ہم انتخاب نہیں کر سکتے، بلکہ اس میں ہمیں خود داخل ہونا پڑے گا۔ زیادہ سے زیادہ ہم یہ کر سکتے ہیں کہ طرفین (

شعور/لاشعور، جسم/روح، حق/باطل) میں سے کسی ایک کو مرکز بننے یا 'موجودگی' (PRESENCE) کا ضامن بننے کی اجازت نہ دیں۔۔۔۔۔جیسا کہ پہلے کہا گیا کہ دریدا کے کلاسیکی کارنامے OF GRAMMATOLOGY میں لفظوں پر تصورات کے قائم ہونے کو (LOGOCENTRISM)، لفظ مرکزیت کہا گیا ہے۔ LOGOS یونانی لفظ ہے نیا عہد نامہ میں LOGOS ایسی اصطلاح ہے جو 'موجودگی' کے تصور سے لبالب بھری ہوئی ہے۔۔۔۔ 'IN THE BEGINING WAS THE WORD' (نارنگ، ص، ۲۰۸۔۲۰۷)۔

''صوت مرکزیت (PHONOCENTRISM) کی رو سے تحریر دراصل تقریر (تکلم) کی وہ شکل ہے جو تقریر کی ملاوٹ لیے ہوئے ہے۔ تقریر ہمیشہ اصل خیال سے زیادہ قریب ہوتی ہے۔ جب ہم تقریر (تکلم) سنتے ہیں تو ہم اسے 'موجودگی' (PRESENCE) سے منسوب کرتے ہیں جس کی تحریر میں کمی محسوس ہوتی ہے۔ کسی بھی بڑے خطیب، اداکار یا سیاست داں کی تقریر کے بارے میں برابر محسوس ہوتا ہے کہ یہ 'موجودگی' رکھتی ہے، یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ تقریر بولنے والے کی روح کی تجسیم ہے۔ تقریر کے مقابلے میں تحریر غیر خالص ہے اور اپنے نظام کو تحریری نشانات سے آلودہ کرتی ہے جو بے شک نسبتاً مستقل ہیں۔ تحریر کو دہرا سکتے ہیں، محفوظ کر سکتے ہیں، بار بار چھاپ سکتے ہیں۔ اور یہ تکرار تفہیم اور باز تفہیم کے لامتناہی سلسلے کو راہ دیتی ہے۔ تقریر کی بھی جب تفہیم کی جاتی ہے تو بالعموم ایسا اس کو ضبطِ تحریر میں لا کر ہی ممکن ہے۔ تحریر کے لیے مصنف کی 'موجودگی' ضروری نہیں۔ اس کے برعکس تقریر سے مراد متکلم کی فوری 'موجودگی' ہے۔ مقرر کی آواز فوری ہوا میں تحلیل ہو جاتی ہے اور اس کا کوئی نشان باقی نہیں رہتا۔ اسی لیے تقریر کے خیال میں ملاوٹ کا شائبہ نہیں، جو تحریر میں ممکن ہے۔ قدیم فلسفہ دانوں نے اسی لیے تحریر کی مخالفت کی ہے، کیونکہ وہ خائف تھے کہ تحریر سے فلسفیانہ صداقت کا تحکم ختم ہو جائے گا۔ ان کا کہنا تھا کہ صداقت خالص فکر پر مبنی ہے (منطق، خیالات، قضایا) ان کو تحریر سے آلودگی کا خدشہ تھا۔ فرانسس بیکن ۔۔۔۔۔۔۔'' جاری ہے (نارنگ، ص، ۲۱۰)

۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

ڈاکٹر نارنگ کا ایک اور سرقہ شدہ اقتباس

جو عمران کے پہلے چار مضامین میں پیش کردہ اقتباسات کے بعد کا ہے

In the context of his own concept of ideology, and also of the work of Roland Barthes on literature and Jacques Lacan on psychoanalysis, it is possible to construct an account of some of the implications for critical theory and practice of Althusser's position. The argument is not only that literature re-presents the myths and imaginary versions of real social relationships which constitutes ideology, but also that classic realist fiction, the dominant literary form of the nineteenth century and arguably of the twentieth, 'interpellates' the reader, addresses itself to him or her directly, offering the reader as the place from which the text is most 'obviously' intelligible, the position of the subject (and of) ideology.

According to Althusser's reading (rereading) of Marx, ideology is not simply a set of illusions, as The German Ideology might appear to argue, but a range of representations (images, stories, myths) concerning the real relations in which people live. But what is represented in ideology is 'not the system of the real relations which govern the existence of individuals, but the imaginary relation of those individuals to the real relations in which they live' (Athusser, 1971: 155). In other words, ideology is both a real and an imaginary relation to the world-real in that it is the way that people really live there relationship to the social relations which govern their existence, but imaginary in that it discourages a full understanding of these conditions of existence and the ways in which people are socially constituted within them. It is not, therefore, to be thought of as a system of ideas in people's heads, nor as the expression at a hihger level of real material relationships, but as the necessary condition of action within the social formation. Althusser talks of ideology as a 'material practice' in this sense: it exists in the behaviour of people acting according to their beliefs (155-9).

It is important to stress of course, that ideology is by no means a set of deliberate distortions foisted upon a helpless populace by a corrupt and a cynical bourgeoise. If there are sinister groups of men in shirt-sleeves purveying illusions to the public, these are not the real makers of ideology. In that sense, it has no creators. But, according to Althusser, ideological practices are supported and reproducedin the institutions of out society which he calls Ideological State Apparatuses (ISAs). Unlike the Repressive State Apparatus, which works by force (the police, the penal system and the army), the ISAs pursuade us to consent to the existing mode of production.

The central ISA in contemporary capitalism is the educational system, which

prepares the childer to act in accordance with the values of society, by inculcating in them the dominant versions of appropriate behaviour as well as history, social studies and, of course, literature. Among the allies of the educational ISA are the family, the law, the media and the arts, each helping to represent and reproduce the myths and beliefs necessary to induce people to work within the existing social formation.

The destination of all ideology is the subject. The subject is what speaks, or signifies, and it is the role of ideology to construct people as subject:

The obviousness of subjectivity as the origin of meaning and choice has been challenged by the linguistic theory which has developed on the basis of Saussure's. As Emile Benveniste argues, it is language which provides the possibility of subjectivity, because it is language which enables the speakers to posit himself or herself 'I', as the subject of a sentense. It is in language, inother words, that people constitute themselves as subjects. Consciousness of self is possible only on the basis of the differentiation: 'I' can no be signified or concieved without the conception 'non-I', 'You', and dialogue, the fundamental condition of language, implies a reversible polarity between 'I' and 'You'. 'Language is possible only because each speaker sets himself up as a subject by referring to himself as I' (Benveniste 1971:225). But if in language there are only differences with no positive terms, as Saussure insists, 'I' designates only the subject of a specific utterence.

'It is literally true that the basis of subjectivity is in the exercise of language' .(Belsey, 52-55)(226)

اس سے پہلے کہ میں نارنگ کا سرقہ کیا ہوا اقتباس پیش کروں چند نکات ذہن میں رہنے ضروری ہیں۔سب سے پہلے یہ کہ بیلسی نے جہاں کہیں آلتھیوسے یا ایمیلی بن ونستے کا حوالہ استعمال کیا ہے، وہاں نہ صرف یہ کہ کتاب کا نام بھی دیا ہے بلکہ صفحہ نمبر کا حوالہ بھی دیا ہے۔بیلسی کا آخری اقتباس بن ونستے کی کتاب سے لیا گیا ہے،بیلسی کی کتاب میں اسے اقتباس کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ نارنگ نے بھی یہ اقتباس اٹھایا ہے مگر بن ونستے کا کہیں کوئی حوالہ نہیں ہے۔نارنگ نے تو ۱۹۵۸ میں پی ایچ ڈی کر لی تھی، انھیں تو اقتباسات پیش کرتے وقت ادبی اصولوں کوملحوظِ خاطر رکھنا چاہیے۔تاہم نارنگ ایسا نہیں کرتے۔نارنگ کے حوالے سے ہم دیکھیں گے کہ نارنگ نے جہاں انگریزی اقتباس استعمال کیا ہے وہاں نہ ہی صفحہ نمبر ہے اور نہ ہی اس اصل مآخذ کا کہیں ذکر ہے، جس سے یہ تمام اقتباس چرایا گیا ہے۔پہلے نارنگ کے چرائے ہوئے اقتباس کی جانب چلتے ہیں۔

''آلتھیوسے کے آئیڈیولوجی کے اس تصوّر کو اگر ژاک لاکاں کی 'نوفرائیڈیت' اور رولاں بارتھ کی 'نئی ادبیت' کے ساتھ ملا کر دیکھا جائے تو ادب اور ادبی رویّوں کے مضمرات کے بارے میں آلتھیوسے کا موقف اور کُھل کر سامنے آتا ہے۔ دلیل صرف یہ نہیں کہ ادب اُن حقیقی سماجی رشتوں کی مِتھ یا اُن کا تخیئلی مثنٰی ہے جو آئیڈیولوجی کی تشکیل کرتے ہیں، بلکہ حقیقت پسندانہ فکشن جو اُنیسویں صَدی بلکہ بڑی حد تک بیسویں صدی کا بھی حاوی رجحان ہے، قاری سے براہِ راست خطاب کرتا ہے، اور قاری کو ایسی حیثیت عطا کرتا ہے جس سے ادب آسانی سے سمجھ میں آنے والی چیز بن جاتا ہے، اور یہ حیثیت بطور 'موضوع' نہ صرف آئیڈیولوجی کے اندر ہے بلکہ آئیڈیولوجی کی رُو سے ہے۔آلتھیوسے کی مارکس کی نئی تعبیر کے مطابق آئیڈیولوجی محض تجریدی تصوّرات کا مجموعہ نہیں، بلکہ ڈسکورس (مدلل بیانات)، امیجز، اور مِتھ کی نمائندگیوں کا وہ نظام ہے جو ان حقیقی رشتوں سے متعلق ہے جن میں لوگ زندگی کرتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں آئیڈیولوجی اُن حقیقی رشتوں سے عبارت نہیں ہے افراد کا وجود جن کے تابع ہے، بلکہ یہ عبارت ہے اُس خیالی رشتے سے جو افراد اُن ٹھوس حقیقی رشتوں سے رکھتے ہیں جن کے اندر وہ زندگی کرتے ہیں۔ گویا آئیڈیولوجی دُنیا سے حقیقی رشتہ بھی رکھتی ہے اور تصوّراتی بھی، حقیقی اس لیے کہ یہ وہ طریقہ ہے جس کی رُو سے افراد اُن رشتوں کو جیتے ہیں جو وہ اُن سماجی رشتوں سے رکھتے ہیں جو اُن کے وجود کی حالتوں کا تعین کرتے ہیں۔ اور خیالی اس لیے کہ افراد خود اپنے وجود کی حالتوں کو پوری طرح سمجھ نہیں سکتے اور نہ ہی اُن عوامل کو جن کی رو سے وہ سماجی طور پر اُن حالتوں کے اندر مقیّد ہیں۔ آلتھیوسے کا کہنا ہے کہ آئیڈیولوجی تصورات کا ایسا نظام نہیں ہے جسے افراد اپنے ذہنوں میں لیے پھرتے ہوں، یا جس کا اظہار مادیاتی رشتوں کی کسی اعلیٰ سطح پر ہوتا ہو، بلکہ یہ 'سماجی تشکیل' کے اندر افراد کے عمل کی ضروری حالت ہے: ۔۔۔۔۔۔۔

آلتھیوسے نے اپنے نظریہء آئیڈیولوجی میں اس نکتے پر بھی روشنی ڈالی ہے کہ آئیڈیولوجی لازماً کوئی ایسی شئے نہیں ہے جسے بورژوازی نے محنت کش طبقے پر لاد دیا ہو۔ آئیڈیولوجی اس اعتبار سے پیدا کی نہیں جاتی کہ یہ ضرورتاً موجود ہے۔ البتہ آئیڈیولوجیکل 'معمولات' سماجی اداروں میں

پیدا کیے جاتے ہیں، اور پروان چڑھائے جاتے ہیں۔ آلتھیو سے ان اداروں کو

IDEOLOGICAL STATE APPARATUSES

کہتا ہے۔ اس طرح وہ ان میں اور ریاستی جبر کے آلہ ہوئے کار (REPRESSIVE STATE APPARATUSES) مثلاً پولیس، فوج، عدلیہ وغیرہ میں فرق کرتا ہے۔ ریاستی آئیڈیولوجیکل آلہ ہائے کار میں وہ سرمایہ دارانہ ماحول کے نظامِ تعلیم کو مرکزی حیثیت دیتا ہے جس کی رُو سے بچّے کے ذہن میں تاریخ ، سماجی مطالعات، اور ادبی تربیت کے ذریعے شروع ہی سے اُن اقدار کو بٹھا دیا جاتا ہے جن کی سماج اجازت دیتا ہے اور جو سماج کے نظام سے ہم آہنگ ہیں۔ اس ضمن میں جو ادارے نظامِ تعلیم کا ساتھ دیتے ہیں یا اُس کے ساتھ کارگر رہتے ہیں، وہ ہیں خاندان، قانون، میڈیا اور آرٹ۔ یہ سب کے سب اُن ایقانات اور متھ کو رواج دیتے اور اُنھیں مضبوط بناتے ہیں، جن کی رو سے موجود 'سماجی تشکیل' کے اندر انسان عمل پیرا ہوتا ہے۔ آئیڈیولوجی کا اصل مقام 'موضوع' ہے، (یعنی 'فرد' سماج کے اندر) اور اس کا اصل کام عوام کو بطور 'موضوع' تشکیل دیتا ہے:

'TO CONSTRUCT PEOPLE AS SUBJECT'

سہ "لیکن 'موضوعت' (SUBJECTIVITY) کے اس تصوّر کو اُس لسانیاتی ماڈل نے تہس نہس کر دیا ہے جو سوسیئر کے خیالات کی رو سے وجود میں آیا ہے۔ ایمیلی بن وے نستے (EMILE BENVENISTE) کے مطابق وہ زبان ہی ہے جو موضوعیت کا امکان پیدا کرتی ہے، یعنی زبان ہی کی رو سے متکلم خود کو 'میں' کہہ کر قائم کرتا ہے جو کلمے کا موضوع ہے۔ زبان ہی کے ذریعے عام انسان بطور موضوع تشکیل پاتا ہے۔ نفسِ انفرادی کا شعور قائم ہی اس فرق پر ہے۔ 'میں' کا کوئی تصوّر 'غیر میں' کے بغیر ممکن نہیں۔ اور مکالمے میں جو زبان کی بنیادی شرط ہے، 'مَیں' اور 'تم' کے فرق کی طرفیں بدل بھی سکتی ہیں۔ زبان ممکن ہی اسی لیے ہے کہ ڈسکورس میں ہر متکلم خود کو 'میں' کہہ کر 'موضوع' ہو سکتا ہے۔ لیکن اگر زبان سوسیئر کے مشہور قول کے مطابق افتراقات کا نظام ہے بغیر اثباتی عناصر کے، تو 'میں' کی موضوعیت فی نفسہٖ قائم ہو ہی نہیں سکتی، کیونکہ 'میں' محض مخصوص کلمے کا موضوع ہے۔ پس ثابت ہے کہ موضوعیت قائم ہوتی ہے زبان کے استعمال سے"

(نارنگ، ۲۵۸-۲۵۶)۔

فکری سطح پر بددیانتی کی شاید ہی اس سے بدترین مثال کہیں دکھائی دے۔ قاری اگر اندھا نہ ہو تو وہ دیکھ سکتا ہے کہ کس طرح نارنگ نے صفحات کے صفحات محض ترجمہ کر کے اپنے نام سے شائع کرا لیے ہیں۔ اوپر دیکھیں کہ کس طرح نارنگ نے یہ فقرہ انگریزی میں پیش کیا ہے، 'TO CONSTRUCT PEOPLE AS SUBJECT'، اس کا مطلب یہ ہوا کہ نارنگ یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ صرف یہی ایک فقرہ انھوں نے انگریزی سے لیا ہے۔ ہم واضح طور پر دیکھ سکتے ہیں کہ تقریباً دو صفحات بیلسی کی کتاب سے دیگر ابواب کی طرح انتہائی بددیانتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے چرائے گئے ہیں۔ نارنگ کے حواری یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ کتاب کا نام حواشی میں درج ہے۔ ایسا کہتے وقت وہ بھول جاتے ہیں کہ ترجمہ کر کے کتاب کا نام دینے سے کوئی مصنف نہیں کہلا سکتا۔ جب الفاظ کو جوں کا توں نقل کیا جاتا ہے، تو انھیں واوین میں رکھا جانا چاہیے۔ بیس مختلف کتابوں سے بیس ابواب ترجمہ کر کے کوئی مصنف نہیں کہلا سکتا۔

خلاصۂ کلام اور حامیانِ نارنگ صاحب کو چیلنج کہ اسے غلط ثابت کریں

۱۔ نارنگ صاحب کی کتاب کے صفحہ نمبر ۳۳ سے لے کر ۳۴۴ تک صرف بیس صفحات بھی ایسے نہیں ہیں جو انگریزی کتابوں کا لفظ بلفظ ترجمہ نہ ہوں۔

۲۔ ٹیرنس ہاکس کی کتاب Structuralism and Semiotics پیراگرافس کے معمولی ادل بدل کے ساتھ پوری کی پوری اپنی کتاب میں شامل کر لی ہے۔

۳۔ رامن سیلڈن کی کتاب Contemporary Literary Theory سے جو سرقہ کیا گیا ہے اس کی ایک جھلک۔

رامن سیلڈن کی کتاب کے صفحات	گوپی چند نارنگ کی کتاب کے صفحات
27 - 42	79 -106
49 - 70	288 - 329
149 - 158	234 - 240
86 - 103	243 - 267

injustice earlier. In support of Saussure's argument Belsey had quoted more examples as given by Jonathan Culler and Louis Hjelmslev in their separate books—properly acknowledged by Belsey. Dr. Narang has translated those examples, without mentioning Belsey, and then cited the page numbers given by her as if he were quoting directly from Culler and Hjelmslev.

But what really surprised me was on the opposite page (p. 69), where Dr. Narang, leaving the safety of translation, offers his own examples for Saussure's contention. "If we wish to see," Dr. Narang begins, "there is no lack of such examples even in Urdu where words are similar but meanings are different. Just take [the terms for] kinship. Baba is used in Urdu for 'father,' the same as Abba, while in Hindi it is used for 'grandfather.'" He then goes on in that vein for the next 13 lines, citing how some words mean one thing in Urdu but quite another in Arabic, from which Urdu borrowed them.

Apparently, Dr. Narang totally failed to comprehend (afham) Saussure's radical notion that different languages divide the world differently—even after Belsey further explained it by citing examples given by Culler and Hjelmslev. (A correct example for Urdu readers would have been how Urdu divides the world of "parents' siblings" into chacha, phuphi, mamun, and khala, while English divides the same world into "Uncle" and "Aunt.")

Dr. Gopi Chand Narang is presently a "Member, Advisory Committee on Culture, government of India," which is symptomatic of the bigger, truly serious issue: the utterly cynical and self-serving attitude of a great many people who walk the corridors of power in New Delhi, wearing cloaks labelled "Culture" and "Education" and bartering favours among themselves. The big issue is not the individual, who did what he considered was necessary in order to prosper in Indian academia and win patronage from politicians. Let us also not forget that it was the literati of India who chose Dr. Narang to preside at the Sahitya Akademi, over Mahashweta Devi, one of India's most honest and courageous writers. The rot has settled deep and at many places, and unless more people begin to protest, challenge, and condemn publicly what they shake their heads over privately, nothing much is going to change in Education and Culture.

....

http://outlookindia.com/article.aspx?261517

Jagdish Prakash to Haider Qureshi

Aug 28, 2009 01:45 PM

1 Facts provided by C.M.Naim are eye-openers.
I am also getting so many emails from our literary world.
Here I want to share an e-mail of a friend regarding this subject.

:::

"Dear Haider Saheb,

I thank you for being so proactively pursuing the question of purity of thought, creativity and expression in Urdu making Dr.Gopi Chand Narang's case as symptomatic of the malaise.

While this kind of plagarism is condemnable unequivocally, Mr. C.M.Naim has drawn attention to another issue of manipulations in the corridors of powers to win patronage and positions. This is what had happened in case of Dr.Narang. This is a weakness of the system because of it real talent suffers while mediocrity thrives.

I also wish to inform you that I am presently in Canada and will move back to India around 25th September.

Jagdish Prakash"

:::

Haider Qureshi
Okriftel,Hattersheim, Germany

http://outlookindia.com/article.aspx?261517

(afham-o-tafhim; lit. “comprehension and explanation”), all the while avoiding—as it is required in the discipline of Philosophy—any coloration from my own imagination (takhyil ki rang-amezi) as well as any subjective flight of thought of my own (mauzu’i khayal-bafi).

The first two parts of my book—[entitled “Structuralism” and “Post-Structuralism”]—are of the analytical kind (tashrihi nau’iyat). The third part—[entitled “Eastern Poetics”] and the final section [of conclusions] are of a very different nature. In my expositions of the New Philosophers and their ideas and insights I have unhesitatingly used akhz (“adaptation”) and qubul (“extraction;” lit. “acceptance”). Where it became necessary I also used talkhis (“abridgment”) and tarjuma (“translation”). In order to retain the force of the argument I have also quoted at many places from the original texts so that the philosophical issue or the insight of the thinker might reach the Urdu reader with its full impact. To every section of the book I have attached a bibliography of all its sources.

Further, in the bibliographies, I have marked with a star the books that I used much more extensively than others. Let me make it clear: the ideas are not mine, they are of Saussure, Levi-Strauss, Roman Jacobson, Lacan, Derrida, Barthes, Foucault, Kristeva, Shklovsky, Bakhtin, etcetera. That is why I have dedicated my book to all the philosophers and thinkers whose ideas it consists of. And I have clearly indicated in my Introduction: “The concepts and ideas (khayalat aur nazariyat) are of the Philosophers, the understanding, explanation, and language (afham-o-tafhim aur zuban) are mine.”

Dr. Narang is right about the lack of established terminology in Urdu literary criticism. We must, therefore, take him at his precise word when he claims that the first two chapters of his book were “analytical” (tashrihi), and that what he had done as a whole was to first comprehend (afham) and then explain (tafhim)—in his own language (zuban), Urdu—the ideas and concepts of the people whom he calls the “New Philosophers.” That, however, is exactly what Bhinder has solidly refuted. According to him, only the language (Urdu) is Dr. Narang’s; the analysis and exposition are by other people—Raman Selden, John Sturrock, Catherine Belsey, Terence Hawkes, and many more who find no mention in the interview. Nor are their names mentioned in the “Introduction” and the “Dedication.” They make only desultory appearances in the expository chapters, and seldom when whole lines of their English become Dr. Narang’s Urdu. To give just one example from the many that Bhinder

meticulously identifies, Christopher Norris, in his book Deconstruction: Theory and Practice (3rd edition, London, 2002), writes on Derrida at some length on pages 18 and 19. Bhinder has quoted fifteen lines from those pages (‘Akkas International, #9, p. 87), and identified them as the original of ten lines in Dr. Narang’s book (pp.217–8). One might say that turning fifteen lines into ten was a nice act of summarization (talkhis), but what is one to make of the fact that every Urdu sentence in those ten lines is the exact translation—not a summary—of some sentence in the fifteen lines of English—and the Urdu sentences occur in the original English order?

When I looked up the Urdu pages cited by Bhinder, I found that Dr. Narang had actually mentioned Norris’s book two pages earlier, calling it “the best and most comprehensive” book on “Deconstruction.” It is also listed in the bibliography of his sources for the chapter. The book is starred—as explained by him above—but then so is also Ludwig Wittgenstein’s Philosophical Investigations, listed two names below Norris. No page numbers are listed in either case. Are we then to assume that Dr. Narang used Norris and Wittgenstein equally extensively in his “analysis” and “exposition” of Derrida’s ideas?

Rereading Bhinder’s first article in the special issue of ‘Akkas Intrnational and checking its accuracy, I stumbled upon something else. On pages 29 and 30 of the journal, Bhinder states that Dr. Narang had extensively translated passages from Catherine Belsey’s introductory textbook, Critical Practice. One of the examples he cites is this passage in Belsey’s book:

Saussure’s argument depends on the different division of the chain of meaning in different languages. ‘If words stood for pre-existing concepts they would all have exact equivalents in meaning from one language to the next; but this is not true’ (Saussure, 1974: 116). The truth is that different languages divide or articulate the world in different [ways]. Saussure gives a number of examples. For instance, where French has the single word mouton, English differentiates between mutton, which we eat, and sheep, which roams the hills. (pp. 36–37.)

I compared it with the passage he mentions in the Urdu book (p. 68). The Urdu is a meticulous translation of the English—it even includes the page number in Saussure’s book, which, as Bhinder points out, creates the false impression that Dr. Narang was quoting directly from Saussure. As I compared Dr. Narang’s page 68 with Catherine Belsey’s page 39 (a different edition from what Bhinder used), I realized that Dr. Narang had twice done the same

The Emperor's New Clothes

The recent case of plagiarism is only symptomatic of the truly serious issue: the utterly cynical and self-serving attitude of a great many people who walk the corridors of power in New Delhi, wearing cloaks labelled 'Culture' And 'Education'

C.M. Naim

on Gopi Chand Narang

My previous note concerning the scandal swirling around Dr. Gopi Chand Narang's award-winning Urdu bookon Structuralism, Post-Structuralism and Eastern Poetics was based on the three Urdu articles by Imran Shahid Bhinder of Birmingham City University that appeared in various issues of the journal Jadeed Adab (published from Okriftel, Germany, and Delhi, and also available on the web). Since then I have obtained a copy of the special issue of 'Akkas International, #9 (2009), published from Islamabad (also available on the web). Besides a fourth, well-documented essay by Bhinder, it includes some other interesting and revealing articles.

In one such article ("The Story of Jadeed Adab No. 12"), Haidar Qureshi, the editor of Jadeed Adab, reveals how he was forced to exclude from that particular issue material that was critical of Dr. Narang. "The previous four issues (Nos. 8, 9, 10, and 11)," Qureshi writes, "were published by Mustafa Kamal Pasha Sahib of the Educational Publishing House, Delhi… I liked Pasha Sahib as my publisher. And so I sent him the final files of the 12th issue. It was printed in October 2008. But before it could go to the binders, Dr. Gopi Chand Narang put pressure upon the publisher by threatening legal action. Pasha Sahib, rightly, did not wish to be dragged into any litigation… And so the binding was stopped. Dr. Narang wanted that Jadeed Adab should not publish anything against him." And so only a censored version of the 12th issue came out in 2009. (Qureshi informs me that I was in error when I wrote

the magazine was no longer published from Delhi. It still is, but under the contract it cannot include any article or letter that is critical of Dr. Narang.) After reproducing the censored letters, Qureshi concludes his essay by appealing to the government of India to take notice of this act of blackmailing. Qureshi's article also appeared in the Urdu quarterly Asbat, Mumbai, in its issue # 3, Dec. 2008–Feb. 2009. But it went unnoted—like Bhinder's three articles between July 2007 and October 2008—by the academics and authorities at the Aligarh Muslim University and Maulana Azad National Urdu University who conferred honorary degrees on Dr. Narang early this year.

The most interesting thing for me was to discover that, contrary to my earlier belief, Dr. Narang had in fact defended himself in print—in an interview given to Nand Kishore Vikram, the editor and publisher of Adab-i-'Aliya International ("Classics International"), a magazine infrequently published from Delhi. The interview appeared in its issue for April–June 200; the relevant portion is reprinted in the special issue of 'Akkas International, (p. 109). I immediately posted a translation in the 'Comments' to my first essay; here is a revised version:

Nand Kishore Vikram: People say that those who presented Structural Criticism (sakhtiyati tanqid) in Urdu did so either through translation (tarjuma) or by means of adaptation (akhz) and summarization (talkhis). What do you say about that?

Gopi Chand Narang: When I began my work on "Theory" I was aware—my training is in Structural Linguistics (sakhtiyati lisaniyat)—that the fundamental requirement in Philosophy (falsafa) was Scientific Objectivity (sa'insi ma'ruziyat). I had before me many examples where people started with some talk of Philosophy but very soon began to soar on wings of Imagination, eventually becoming victims of their own silly inventions (ijad-i-banda). Many of them toiled to make themselves more prominent than the original texts, while others succumbed to their own writing style and wrote what would be called light entertaining essays (insha'iya).

[The problem I faced] was that the needed terminology did not exist in Urdu. Secondly, the style of writing of the New Philosophers was so complex, so brimful with meaning, and so dense that it was a major issue for me to transfer it [into Urdu] with scientific accuracy and objectivity. In order to maintain the "Preciseness" and "Rigour"—[both words are in English in the original]—of their texts it was necessary for me to use all available means in my expositions

where Selden discusses Bertolt Brecht, Theodor Adorno, and Walter Benjamin The second was equally curious: in Selden's book, page 98 deals with Frederic Jameson, but pages 99–102 contain only a bibliography. Again, the opening paragraph of Dr Narang's note on Jonathan Culler (pp. 318–9) is, as per Bhinder, entirely Selden's (p. 62). But in the sources, Selden's name is listed with page numbers 106–27! In other words, while Dr Narang twice went to the trouble of indicating precise—though unrelated—pages in Selden's book, he somehow failed to include the pages he had actually abused.

Bhinder's charges are extremely serious. They are also thoroughly documented. First made three years ago, his accusation has remained unchallenged—unlike in the past when the slightest criticism of Dr Narang promptly produced a spate of articles in his defence and diatribes against the critic. This time he and his admirers are remarkably silent. And for good reason. They understand that any attempt would only bring more notoriety. Sadly, they also know that the academic circles in India in general, and the university departments of Urdu in particular, take no notice of inconvenient details. With them it is always "business as usual." After all, soon after Bhinder's original article came out in 2006, Dr Narang received the degree of 'D.Litt. Honoris Causa' from the Central University at Hyderabad. Then after two more articles, two similar honorary degrees were conferred on him in the past six months, by the Maulana Azad National Urdu University and the Aligarh Muslim University.

Sahitya Akademi has an excellent policy of making its award-winning books available in other major languages of India, including English. Dr Narang's book received the award some fourteen years ago, but, to my knowledge, it has so far been translated only into Hindi (2000). May I ask the Akademi to do a major favour to Urdu letters? Marathi and Bengali scholars, in my experience, are usually far more knowledgeable about modern and pre-modern literary theories than an average Urdu academic. (I very much include myself among the latter.) The Akademi should have Dr Narang's award-winning book translated into both Bengali and Marathi so that it can properly be judged by his peers in India. Given the international protocols on copyright, however, an English translation might not be advisable at this time.

C.M. Naim is Professor Emeritus, University of Chicago

http://www.outlookindia.com/article.aspx?26010
http://thenews.jang.com.pk/daily_detail.asp?id=191143
http://www.southasianmedia.net/index_opinion.cfm?category=Culture&country=Pakistan#C%20M%20Naim
http://www.urdustudies.com/pdf/24/39Columns.pdf

C.M. Naim

Aug 03, 2009 02:20 AM

I have now learned from Dr. Narang's website that his book has been translated in several Indian languages besides Urdu and Hindi. The site states: "Samrachnavad, Uttar-Samrachnavad evam Prachya Kavyashastra (trs. by Devesh), Sahitya Akademi, New Delhi 2000. (Besides Hindi, this book is also published in Tamil, Marathi, Punjabi, Bengali, Bengali, Maithili, Gujarati, Kannada and Malayalam; translation in progress in Kashmiri, Telugu and Oriya)." I hope someone in those languages will also do some checking of their own.

C. M. Naim
Bara Banki, India

http://www.outlookindia.com/article.aspx?260108

....

S. Singh

Jul 29, 2009 10:59 PM

Plagiarism is not a new word for literary circle. There are several creations here which are the modified version of old ones. Your detailed study on Mr. Narang has only confirmed the deep routed menace of literature. I used to be an amateur in this topic, few years back I liked to read and find out who is copying from whom, its been several years since I left this practice. But I do remember some faint charges on Gopichand narang before. I have also heard that Harivansh rai bachchan's creation "madhushala" is not his creation, it is a modified/manipulated copy of omer khayyam's poetry. However, solid proof is yet to be discovered. Literary bankruptcy has become a common trait of our era.

S Singh
Hyd, India

http://www.outlookindia.com/article.aspx?260108

....

job—no one did, as I remember—but he went on to become a full professor, and soon chaired the department for a while. Needless to say he received—justly, I must add—a 'Padma Shri' as a fiction-writer.

Presently the Urdu literary/academic world has been violently shaken by what must be termed "the mother of all plagiarisms". Instead of the out of fashion field of Aesthetics, it is the currently much more fashionable field of Literary Theory that is at issue, and the person at the 'heart of darkness' is no less than Dr. Gopi Chand Narang, Professor Emeritus, Delhi University, who from 2003 to 2007 presided over the Sahitya Akademi and has received two "Padma" awards from the Indian state—the latest being "Padma Bhushan" in 2004. (A full list of his honours and publications may be seen at his website. At the centre of the scandal is the book Sakhtiyat, Pas-i-Sakhtiyat Aur Mashriqi Shi'riyat ("Structuralism, Post-Structuralism, and Eastern Poetics"), for which Dr Narang received the Sahitya Akademi award in 1995. Though the title suggests that it might be a comparative study, bringing out the commonalities and oppositions between two contemporary Western literary/linguistic theories and their counterparts in Sanskrit and Urdu—a rather curious undertaking—but in reality it only describes and explains the three topics in the book's title, and the major thinkers who contributed to them.

As far back as 1997, an Indian Urdu critic named Fuzail Ja'fari had explained in some detail how Dr Narang's book shied away from original thinking and analysis, limiting itself simply to what X wrote and Y said in Western languages (Zahn-i-Jadid, Delhi, #22-3). In fact, he described the book as a "compilation" (talif), adding that it was not an original piece of writing (tasnif). Now a young scholar Imran Shahid Bhinder, a doctoral candidate in the Department of English at the University of Birmingham, U.K., has made a much more serious charge. Bhinder published in 2006 in the annual issue of Nairang-i-Khayal, a Pakistani journal, an essay entitled "Gopi Chand Narang is a Translator, not an Author." A year later, a revised and expanded version of the essay appeared in the journal Jadeed Adab (July–December, 2007), which at the time was printed at New Delhi—now allegedly stopped under pressure from certain people—and published from Germany. (It is also available on the web). In 2008 Bhinder published two more articles in Jadeed Adab, the first in its January–June issue, entitled "Plagiarism in Urdu Literature – How Long will it be Defended?" and the second in the July–December issue, entitled "Gopi Chand Narang's 'Truth' and 'Context' [as] Thievery." Both articles

found plenty of circulation in both India and Pakistan, and excerpts were reproduced in a couple of Indian journals. Now a Pakistani journal, 'Akkas, published from Islamabad, has brought out a special issue devoted to Dr Narang's oeuvre and career, including a more detailed analysis by Bhinder. (Also available online)

In summary, Bhinder has most convincingly established that Dr Narang's achievement in that award-winning book is not that of an author but only of a translator, and that too of a reprehensible kind. According to Bhinder, Dr Narang did not read the original authors—Ferdinand de Saussure, Claude LeviStrauss, Roland Barthes, Jacques Derrida, Jacques Lacan, Michel Foucault, and others. He read only their well-known interpreters, and then transferred the latter's analyses and interpretations into Urdu, doing so verbatim and without giving the reader any indication of what he was doing. In his third article mentioned above, Bhinder has given extraordinary details of the Dr Narang's "authorial" enterprise. He has quoted excerpts from the Urdu book and then placed them next to their unacknowledged English original. Further, he has listed with precision the countless pages in Dr Narang's book that correspond almost word-for-word with the English pages of American and British scholars. For example, pages 79–106, 234–240, 243–267, and 288–329 of Dr Narang's book, according to Bhinder, are exact translations of pages 27–42, 149–158, 86–103, and 49–70, of Raman Selden's book, A Reader's Guide to Contemporary Literary Theory (1985). The other exploited scholars that Bhinder similarly identifies are Terence Hawke, Catherine Belsey, John Sturrock, Jonathan Culler, Christopher Norris, and Robert Scholes. (I must add that Bhinder's critique has some other dimensions too that are important and relevant for all academics in a general manner. See: here.)

The evidence Bhinder presents is quite irrefutable. When, for example, I checked the pages he points out in Selden's book, they indeed turned out to be the unacknowledged source of Dr Narang's remarks. I also stumbled upon something equally interesting. Dr Narang has a note on Michel Foucault (pp. 193–8) in the second chapter in his "Book Two," i.e. the second section of his book. The text on pages 194–6, as pointed out by Bhinder, is merely a translation of pages 158–9 in Selden's book. I checked the "sources" that Dr Narang's has helpfully listed for each chapter, and found that he does list Raman's book as a source for that particular chapter. And gives exact page numbers too: 79–84 and 98–102. The first reference, however, turned out to be

Plagiarize And Prosper

Dr. Gopi Chand Narang, Professor Emeritus, Delhi University, former President of the Sahitya Akademi and the recipient of two "Padma" awards, stands accused of massive plagiarism in his award-winning book.

Monday, August 03, 2009

C M Naim

There was a time when people wrote a literary piece and then ascribed it to someone whom they held in high esteem out of love, admiration, reverence or some other strong sentiment. Jalaluddin Rumi wrote a magnificent volume of ghazals but did not put his name to it. It has always been known as Diwan-i-Shams-i-Tabriz (The Diwan of Shams of Tabriz). An unknown poet wrote another, smaller diwan of ghazals and ascribed it to Khwaja Mu'inuddin Chishti of Ajmer. Later some other people concocted 'table-talks' of some of the Chishti Sufis and circulated them as genuine collections. In Urdu literary history, two examples of something similar immediately come to mind. When Muhammad Husain Azad desired to publish a definitive edition of the ghazals of Shaikh Ibrahim 'Zauq,'—the first poet laureate of Bahadur Shah 'Zafar'—he felt no qualms in composing new ghazals and verses to fill in the gaps he felt his beloved master would have filled in himself. Then there is the fascinating case of one of the foremost modern poets in Urdu: when Sana'allah Dar took on the name "Miraji" after a woman named Mira whom he obsessively loved, he might have had in mind the exemplary bond between Rumi and Shams.

Urdu literary culture, however, has known many more cases where someone took the work of another person and claimed it as his own. Particularly among the poets. The practice of ustadi/shagirdi in Urdu poetry encouraged it. Many an ustad or master poet earned his meagre living by giving away his verses to his pupils or shagird, who in turn provided for his needs. Some ustad openly sold verses to anyone who came with money the night of a musha'ira (a gathering of poets). A nawab or king would appoint some good poet as his ustad and then quite as a norm expect him to put together a volume of ghazals

in his name. It also happened in prose. Imam Bakhsh 'Sahba'i', a contemporary of Ghalib and teacher at the famous Delhi College, reportedly wrote for a Mughal prince a tazkira or account of the poets of his time. The book, Gulistan-i-Sukhan, carries the name of Qadir Bakhsh 'Sabir' as its author, but Ghalib always referred to it as "Sahba'i's tazkira." Much later, when the Anjuman-i-Taraqqi-i-Urdu ("Association for the Development of Urdu") published The Standard English-Urdu Dictionary in 1937, the organization's Secretary, Maulvi Abdul Haq (a.k.a "Father of Urdu"), put his own name on the cover as its editor, instead of the Anjuman's. But at least he was honest enough to clearly acknowledge in the Introduction that the work had mainly been done by Dr. Abid Husain of Jami'a Millia. Since then, however, things have been going downhill in Urdu, particularly in its academia. The late Azhar Ali Farooqui of Allahabad earned his living by writing Ph.D. dissertations for others, with the full knowledge of the university's professors. I personally witnessed how he worked.

In the old literary culture plagiarism of the ordinary kind was also common and not made much of. The stakes were not high then. But now the stakes are quite high in the academic world. Ambitious university teachers no longer can make do by merely taking care of their patron's grocery shopping and milk cows—I witnessed both at Aligarh. Now they must publish "research" in order to get coveted promotions and titles. Sadly, quite a few take to plagiarism as the shortest route. I became involved in the case of one such ambitious academic at Aligarh back in the early 1980s. The Department of Urdu, Aligarh Muslim University, had obtained some money from the government for a professorship in Aesthetics, and advertised the job. One of the candidates was a Reader in the department, who was far better known for his fiction than research—he wrote at least one superb novella that will always be admired. In no time that gentleman managed to publish a volume on Urdu Aesthetics. I was most surprised when I came across the book in our library at the University of Chicago. Having known the person since our shared college days, I couldn't imagine him as the author of the book. A couple of hours of digging around in the library solved the mystery. The talented academic had taken a well-known book on Aesthetics in English by a Bengali scholar and diligently translated most of it into Urdu. Dutifully I prepared a short article, presenting page-and-line references to the original. It was published in Urdu, and received plenty of notice. But nothing actually happened. The gentleman didn't get the